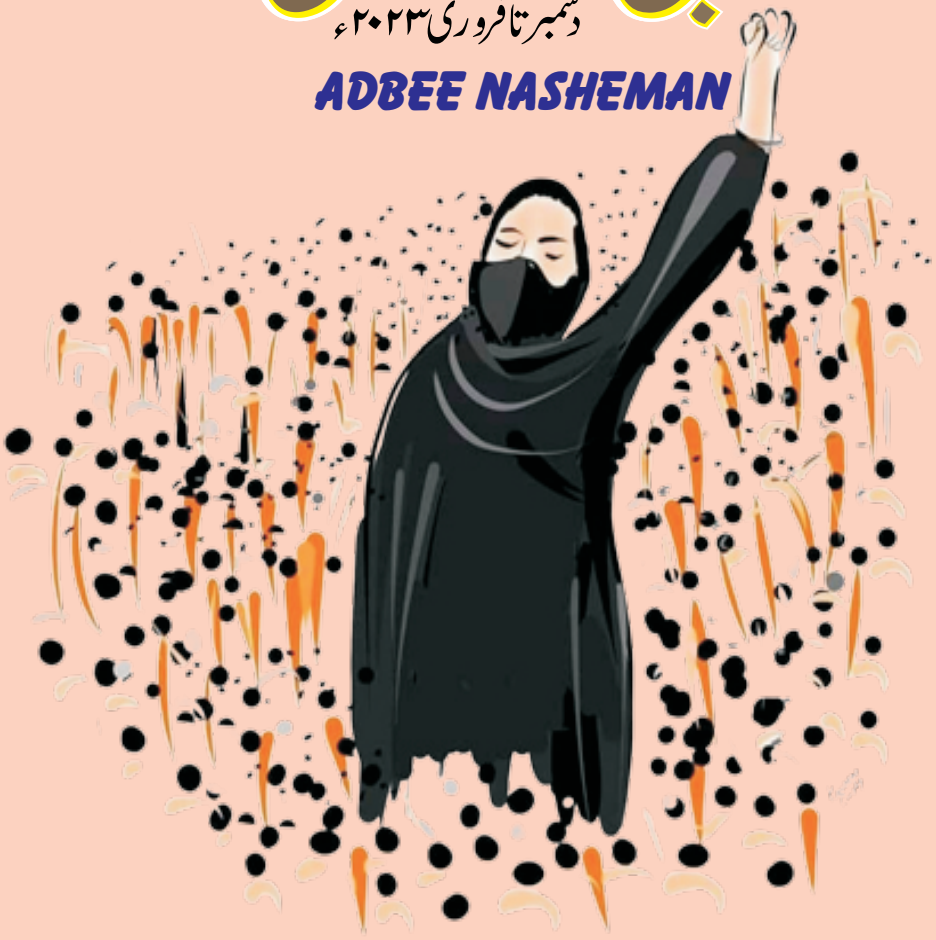
ISSN: 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن لکھنؤ

دسمبر تا فروری ۲۰۲۳ء

ADBEE NASHEMAN



جلالِ حسن

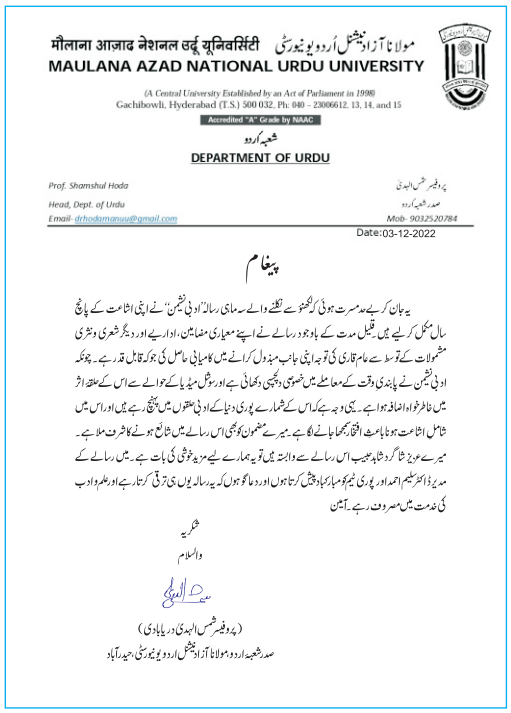
کل دکھی تھی وہ مجھ کو
غازیوں کے مجمع میں / باغیوں کے حلقے میں
حق کے پیروکاروں میں / انقلابی نعروں میں
لشکرِ شجاعت میں / کاروانِ ہمت میں
اس کی جس کلائی میں / میرے نام کا کنگن
کروٹیں بدلتا تھا / آج اس کلائی پر
اک سفید پٹی تھی / جس پہ خون کے چھینٹے
غالباً بتاتے تھے / گویا اس نے کل شب ہی
چوڑیوں کو توڑا ہو / اس کی چوڑی پیشانی
جس پہ زخم کا گہرا / اک نشان ابھرا تھا
ظلم اور ستم کی جو / داستاں سناتا تھا
اس کی سرمئی آنکھیں / بارہا جنہیں میں نے
جھیل سے ملایا تھا / ان میں خوں ابلتا تھا
غیظ اور غضب میں وہ / انتقام کے شعلے
برہمی کے انگارے / آتشی دہکتے تھے
اس کے پنکھڑی سے لب / اژدہے کی صورت میں
ظلم کے سپولوں کو / غرق کرنے والے تھے
اس کی وہ سیہ زلفیں / ظلم کے مکانوں میں
رات لانے والی تھیں / وہ نشانِ حق تھامے
کاروانِ حق لے کر / جو قدم بڑھاتی تھی
اس کے نقشِ پا یاروں / ریت پر سنہری سی
کہکشاں بناتے تھے / میں ذرا رکا ٹھہرا
دو قدم چلا اور پھر / اس کے نقشِ پا چومے
چوم کر چلا آیا !

– سفر نقوی

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت: ۲۵/روپئے

ادبی نشیمن کے پانچ سالہ سفر کی تکمیل پر مشاہیر کی طرف سے موصول چند تہنیتی پیغامات



مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

(A Central University Established by an Act of Parliament in 1998)
Gachibowli, Hyderabad (T.S.) 500 032, Ph: 040 - 23006612, 13, 14, and 15
Accredited "A" Grade by NAAC

شعبۂ اُردو
DEPARTMENT OF URDU

Prof. Shamshal Hoda
Head, Dept. of Urdu
Email- drhodamanuu@gmail.com

پروفیسر شمس الہدیٰ
صدر شعبۂ اردو
Mob- 9032520784

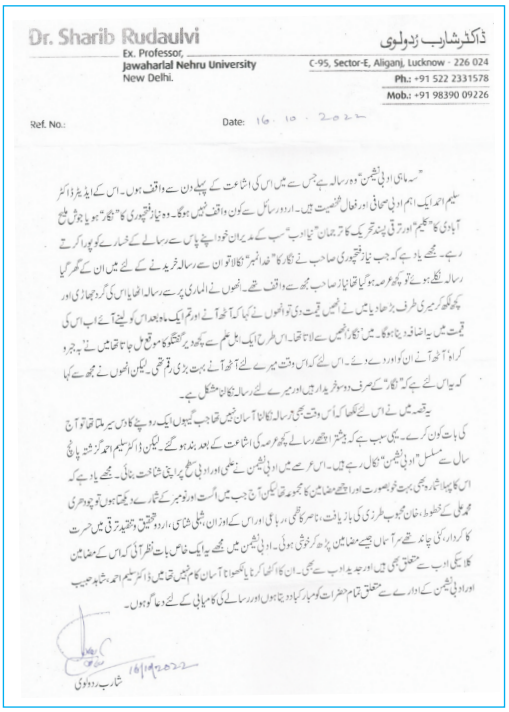
Date:03-12-2022

پیغام

یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ لکھنؤ سے نکلنے والے سہ ماہی رسالہ "ادبی نشیمن" نے اپنی اشاعت کے پانچ سال مکمل کر لیے ہیں۔ قلیل مدت کے باوجود رسالے نے اپنے معیاری مضامین، اداریے اور دیگر شعری و نثری مشمولات کے توسط سے عام قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیابی حاصل کی جو کہ قابل قدر ہے۔ چونکہ ادبی نشیمن نے پابندی وقت کے معاملے میں خصوصی دلچسپی دکھائی ہے اور سوشل میڈیا کے حوالے سے اس کے حلقۂ اثر میں ظاہر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شمارے پوری دنیا کے ادبی حلقوں میں پہنچ رہے ہیں اور اس میں شامل اشاعت ہونا باعث افتخار سمجھا جانے لگا ہے۔ میرے مضمون کو بھی اس رسالے میں شائع ہونے کا شرف ملا ہے۔ میرے عزیز شاگرد شاہد عجیب اس رسالے سے وابستہ ہیں قوی امید ہے کہ ہمارے لیے مزید خوشی کی بات ہے۔ میں رسالے کے مدیر ڈاکٹر سلیم احمد اور پوری ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ یہ رسالہ یوں ہی ترقی کرتا رہے اور علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ آمین

شکریہ
والسلام

(پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی)
صدر شعبۂ اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد



Dr. Sharib Rudaulvi
Ex. Professor,
Jawaharlal Nehru University
New Delhi.

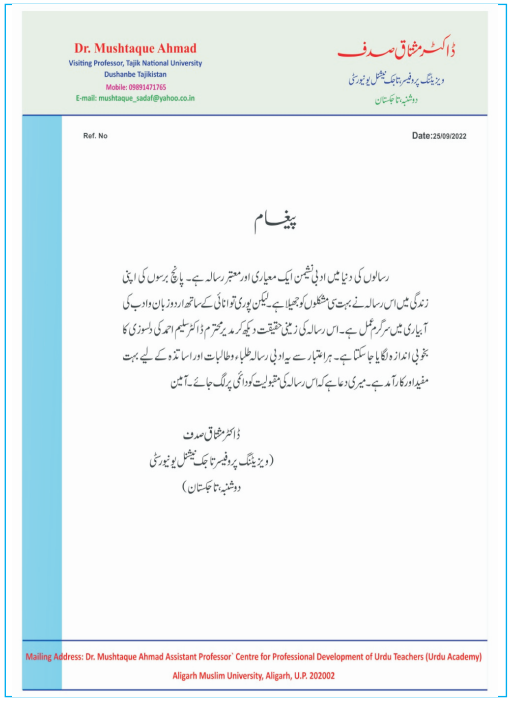
ڈاکٹر شارب ردولوی
C-95, Sector-E, Aliganj, Lucknow - 226 024
Ph.: +91 522 2331578
Mob.: +91 98390 09226

Ref. No.:
Date: 16.10.2022

"سہ ماہی ادبی نشیمن" وہ رسالہ ہے جس سے میں اس کی اشاعت کے پہلے دن سے واقف ہوں۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سلیم احمد ایک اہم ادبی صحافی اور فعال شخصیت ہیں۔ اردو رسائل سے کون واقف نہیں ہوگا۔ وہ نیاز فتحپوری کا "نگار" ہو یا جوش ملیح آبادی کا "کلیم" اور ترقی پسند تحریک کا ترجمان "نیا ادب" سب کے مدیران خود اپنے پاس سے رسالے کے خسارے کو پورا کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب نیاز فتحپوری صاحب نے نگار کا "عدد انبوہ" نکالا تو ان سے رسالہ خریدنے کے لئے میں ان کے گھر گیا رسالہ نکلے ہوئے تو کچھ عرصہ ہو گیا تھا نیاز صاحب واقف تھے۔ انھوں نے الماری پر سے رسالہ اٹھایا اس کی گرد جھاڑی اور کچھ کچھ کریری طرف بڑھا دیا میں نے انھیں قیمت دی تو انھوں نے کہا کہ آٹھ آنے اور قرمایک ماہ بعد اس کو بیچنے آئے اب اس کی قیمت میں یا اضافہ ہو جائیگا۔ میں نگار انھیں سے لاتا تھا۔ اس طرح ایک بل عم سے کچھ زیر تنگستگی کا موقع مل جاتا تھا میں نے "چہ زود کراہ" آٹھ آنے ان کو ادا کر دئے۔ اس لئے کہ اس وقت میرے لئے آٹھ آنے بہت بڑی رقم تھی۔ لیکن انھوں نے مجھ سے کہا کہ یہ اس لئے ہے کہ "نگار" کے صرف دو سو خریدار ہیں اور میرے لئے رسالہ نکالنا مشکل ہے۔

یہ قصہ میں نے اس لئے لکھا کہ اس وقت بھی رسالہ نکالنا آسان نہیں تھا جب گیہوں ایک روپئے کا اس سیر ملتا تھا تو آج کی بات کون کرے۔ یہی سبب ہے کہ بیشتر اچھے رسالے کچھ عرصہ کی اشاعت کے بعد بند ہو گئے۔ لیکن ڈاکٹر سلیم احمد گزشتہ پانچ سال سے مسلسل "ادبی نشیمن" نکال رہے ہیں۔ اس عرصے میں ادبی نشیمن نے علمی اور ادبی سطح پر اپنی شناخت بنائی۔ مجھے یاد ہے کہ اس کا پہلا شمارہ بھی بہت خوبصورت اور اچھے مضامین کا مجموعہ تھا لیکن آج جب میں اگست اور نومبر کے شمارے دیکھتا ہوں تو چودھری محمد علی کے خطوط، خان محبوب طرزی کی بازیافت، ناصر کاظمی، رباعی اور اس کے اوزان، شبلی شناسی، اردو تحقیق و تنقید پر ترقی میں حسرت کا کردار، کئی چاند تھے سر آسماں جیسے مضامین پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ادبی نشیمن میں مجھے یہ ایک خاص بات نظر آئی کہ اس کے مضامین نگارشی ادب سے متعلق بھی ہیں اور جدید ادب سے بھی۔ ان کا اٹھا کر یا بیٹھا نہ آسان کام نہیں تھا میں ڈاکٹر سلیم احمد، شاہد عجیب اور ادبی نشیمن کے دارے سے متعلق تمام حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور رسالے کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔

شارب ردولوی
16/10/2022



Dr. Mushtaque Ahmad
Visiting Professor, Tajik National University
Dushanbe Tajikistan
Mobile: 09891471765
E-mail: mushtaque_sadaf@yahoo.co.in

ڈاکٹر مشتاق صدف
وزیٹنگ پروفیسر تاجک نیشنل یونیورسٹی
دوشنبہ، تاجکستان

Ref. No

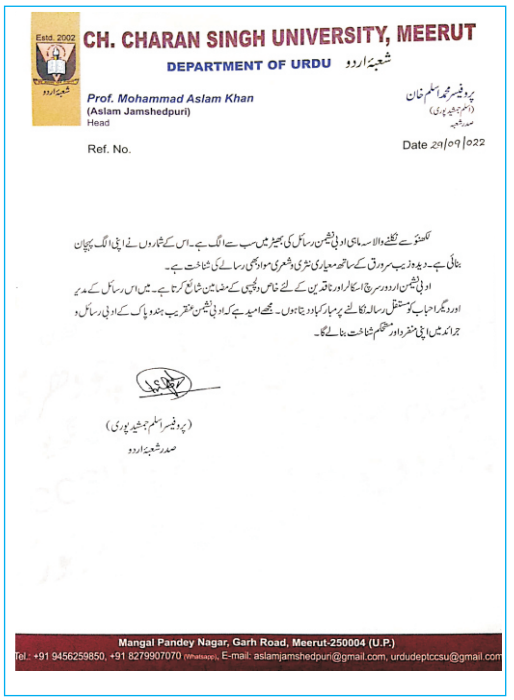
Date:25/09/2022

پیغام

رسالوں کی دنیا میں ادبی نشیمن ایک معیاری اور معتبر رسالہ ہے۔ پانچ برسوں کی اپنی زندگی میں اس رسالہ نے بہت سی مشکلوں کو جھیلا ہے۔ لیکن پوری توانائی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی آبیاری میں سرگرم عمل ہے۔ اس رسالہ کی زمینی حقیقت دیکھ کر مدیر محترم ڈاکٹر سلیم احمد کی دلسوزی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہر اعتبار سے یہ ادبی رسالہ طلباء و طالبات اور اساتذہ کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہے۔ میری دعا ہے کہ اس رسالہ کی مقبولیت کو دائمی پر لگ جائے۔ آمین

ڈاکٹر مشتاق صدف
(وزیٹنگ پروفیسر تاجک نیشنل یونیورسٹی
دوشنبہ، تاجکستان)

Mailing Address: Dr. Mushtaque Ahmad Assistant Professor' Centre for Professional Development of Urdu Teachers (Urdu Academy)
Aligarh Muslim University, Aligarh, U.P. 202002



Estd. 2002
CH. CHARAN SINGH UNIVERSITY, MEERUT
DEPARTMENT OF URDU
شعبۂ اردو

Prof. Mohammad Aslam Khan
(Aslam Jamshedpuri)
Head

پروفیسر محمد اسلم خان
(اسلم جمشید پوری)
صدر شعبہ

Ref. No.

Date 29/09/2022

لکھنؤ سے نکلنے والا سہ ماہی ادبی نشیمن رسائل کی بھیڑ میں سب سے الگ ہے۔ اس کے شماروں نے اپنی الگ پہچان بنائی ہے۔ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ معیاری نثری، شعری مواد بھی رسالے کی شناخت ہے۔

ادبی نشیمن اردو سرچ اسکالر اور ناقدین کے لئے خاص دلچسپی کے مضامین شائع کرتا ہے۔ میں اس رسائل کے مدیر اور دیگر احباب کو مستقل رسالہ نکالنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ادبی نشیمن عنقریب ہند و پاک کے ادبی رسائل و جرائد میں اپنی منفرد اور منظم شناخت بنا لے گا۔

(پروفیسر اسلم جمشید پوری)
صدر شعبۂ اردو

Mangal Pandey Nagar, Garh Road, Meerut-250004 (U.P.)
Tel.: +91 9456259850, +91 8279907070 (Whatsapp), E-mail: aslamjamshedpuri@gmail.com, urdudeptccsu@gmail.com

دسمبر تا فروری
۲۰۲۳ء
ISSN: 2581-5482
جلد : ۶
شمارہ: ۱

سہ ماہی

ادبی نشیمن

سرپرست

ڈاکٹر عامر قدوائی (کویت)
ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی (آسٹریلیا)

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد
Mob: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com
adbeenasheman@gmail.com

معاون ایڈیٹر
شاہد حبیب
Mob: 8539054888
shahidhabib10@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر غلام حسین (اجین) — ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
ڈاکٹر مجاہد الاسلام (لکھنؤ) — ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
ڈاکٹر شکیل احمد (مئو) — وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)

تزئین کار: عبدالسمیع قاسمی (Mob:9335737053)

☆ ادبی نشیمن کو RNI سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ Adbee Nasheman کی اسپیلنگ کے ساتھ ملا ہے۔ اس لیے غلط ہونے کے باوجود مجبوراً یہی اسپیلنگ ہر جگہ استعمال کی جارہی ہے۔

☆ ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے خیالات قلمکاروں کے اپنے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا اختیار صرف لکھنؤ کی عدالتوں کو حاصل ہے۔

ADBEE NASHEMAN

قیمت

فی شمارہ	:	۲۵/روپے
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۳۰۰/روپے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک)	:	25 $ (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵/روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

www.adbeenasheman.com
E-mail: adbeenasheman@gmail.com

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست عنوانات

آغاز

۱	حمد	فرحانہ نازنین	۳
۲	نعت	محمد عثمان عازم	۳

اداریہ

۳	نظریہ	ایڈیٹر	۴

مضامین

۴	اردو کی نشوونما میں فارسی اور تاجکی زبان کا رول	پدم شری پروفیسر رجبوف حبیب اللہ	۵
۵	خطیب گلشن آبادی کی غزل گوئی	ڈاکٹر نارائن پاٹیدار	۱۰
۶	ہجور آما: ایک تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر سفینہ بیگم	۱۵
۷	جدید اردو غزل کی آبرو: حسرت موہانی	ڈاکٹر شبانہ نکہت انصاری	۱۸
۸	وفیات برہان پور	محمد اویس سنبھلی	۲۰
۹	بہار میں جدید اردو غزل: سمت و رفتار	ڈاکٹر محمد شرف عالم	۲۴
۱۰	۱۹۶۰ کے بعد کی خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کا جائزہ	ڈاکٹر شاہینہ عبید خان	۲۸
۱۱	ڈاکٹر محمد اسداللہ کی انشائیہ نگاری	تبسم آراء	۳۱
۱۲	غالب کا سفرِ کلکتہ اور اس کے محرکات: ایک جائزہ	سفیان احمد انصاری	۳۳

خراجِ عقیدت

۱۳	اچھا شاعر و شریف انسان: رباب رشیدی	احمد ابراہیم علوی	۴۱
۱۴	رباب رشیدی: بہت سے راز چھپائے رہے وہ دل میں ہی	رضوان احمد فاروقی	۴۲
۱۵	پروفیسر اصغر عباس: ایک اور ستارہ غروب ہوا	ڈاکٹر غلام حسین	۴۶
۱۶	رفعت عزمی: یادوں کے چراغ جلتے ہیں	فرید بلگرامی	۴۸

افسانے

۱۷	ضرورت	رئیس صِدّیقی	۵۱
۱۸	تجارت	اشفاق برادر	۵۲
۱۹	بھگوان کی دیوالی	تنویر اختر رومانی	۵۳
۲۰	امیدنو	فاکہہ قمر	۵۴
	ایک جادوگر	عقبیٰ حمید	۵۶

غزلیات

۲۱	مناجات/نعت پاک/غزل	دیپک روحانی/صدام حسین نازاں/ڈاکٹر اختر ریاض	۵۸
۲۲	غزلیں	ڈاکٹر عرفان بالغ/نوشاد اشہر اعظمی/شمیم احمد شمیم	۵۹
۲۳	سجدے میں/غزل	جمیل اختر شفیق / کوثر تسنیم سپولی	۶۰
۲۴	نظمیں (سیلفی / گمشدہ شناخت)	مشیر احمد مشیر / شاداعظمی ندوی	۶۱

تبصرے

۲۵	کلیاتِ آرزو لکھنوی — مرتب: ڈاکٹر اسرار الحق قریشی	مبصر: محسن عظیم انصاری	۶۲
۲۶	رشید حسن خاں کی ادبی جہات — مصنف: ڈاکٹر ابراہیم افسر	مبصر: محمد سعید اختر	۶۳
۲۷	مراسلات	قارئین	۶۴

حمد باری تعالیٰ

فرحانہ نازنین
Mob. 9470705183

ہے ذہن میں تو خدایا خیال کی صورت
فلک پہ چھایا ہوا ہے جمال کی صورت

تو میرے فن کو بھی اوج کمال دے مولا
چمک ہو میری جہاں میں مثال کی صورت

بنا ہے جب بھی کبھی آدمی فرعون یہاں
ترا غضب بھی دکھا ہے جلال کی صورت

یہ دھوپ، سبزہ، سمندر بہار کا موسم
ترے کرم کا ہے جلوہ کمال کی صورت

ہے نازنین کو یقیں تیری رحمتوں پہ بہت
کبھی تو ہوگا سویرا اجال کی صورت

☆☆☆

نعتِ پاک

محمد عثمان عازم
Mob.8799523690

لطف رب سے امت آقاؐ میں شامل ہوگیا
دل یہ بولا مجھ سے تو جنت میں داخل ہوگیا
کوشش نعت نبیؐ کا جب میں عامل ہوگیا
جو نہ ملنا تھا مجھے از خود وہ حاصل ہوگیا
خوبئ قسمت سے کعبے کی زیارت ہوگئی
فضل ربی آسماں سے جس پہ نازل ہوگیا
جب مدینہ ذوالحلیفہ سے نظر آنے لگا
دور ہی سے دیکھ کر قربان یہ دل ہوگیا
لکڑیاں جنگل سے کاٹیں بیچ دیں بازار میں
اس طریقے سے غنی آقاؐ کا سائل ہوگیا
مرتدوں کو ختم کرنے چل دیے صدیقؓ جب
ہر صحابی جنگ پر از خود مائل ہوگیا
لے کے نام اللہ کا اتری ہے جب اسلامی فوج
نیل کا دریا خوشی سے مثل ساحل ہوگیا
حق ادا کرنے کی کوشش جب کسی شاعر نے کی
وہ برائے نعت آقا قلب بسمل ہوگیا
خاتمہ ایمان پر ہو آرزو عازم کی ہے
طے ہوا ارا سو وہ قرب منزل ہوگیا

☆☆☆

اداریہ



ماہِ نومبر کی ۹ / تاریخ کو علامہ اقبال کے یوم ولادت کی مناسبت سے اس سال بھی پورے ملک میں "عالمی یوم اردو" کا اہتمام ہوا۔ اس موقع پر اردو کی شان میں قصیدے پڑھے گئے، بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے بیت بازی اور مختلف مقابلۂ فنون لطیفہ کا انعقاد ہوا۔ اردو کے فروغ اور تحفظ کے سلسلے میں بڑی بڑی باتیں بھی ہوئیں۔ کسی نے اسے گنگا جمنی تہذیب بتایا تو کسی نے خالص ہندوستانی زبان۔ اس طرح پورے ملک میں اردو کے تئیں ایک طرح کی بیداری لانے کوشش کی گئی۔ گذشتہ سالوں کے مقابلے میں اس سال یوم اردو کا اہتمام زیادہ جوش وخروش کے ساتھ کیا گیا۔ یہ خوش آئند ہے۔ امید ہے یہ اردو کے حق میں فال نیک ثابت ہوگا۔ لیکن اس موقع پر ہمیں اردو کے لیے اپنی جان قربان کرنے والی ہستیوں کو بھی یاد کرنا چاہئے، افسوس! ہم ایسے مجاہدینِ اردو کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔

ملک کی آزادی کے بعد بالخصوص اتر پردیش میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لیے اردو محافظ دستے میں دو ایسے رضا کار بھی شامل تھے جو غیر مسلم تھے لیکن انھوں نے اردو کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ ان میں پہلا نام تھا پنڈت دیونرائن پانڈے کا اور دوسرا تھا جے بہادر سنگھ کا۔ یہ اردو تحریک کو آگے بڑھانے والے بے حد اہم نام تھے۔ اردو محافظ دستے کے رضا کار جب حکومت سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی کوشش میں ناکام رہے تو پنڈت دیونرائن پانڈے میدان میں خم ٹھونک کر آئے۔ انھوں نے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کرتے ہوئے ۲۰ / مارچ ۱۹۶۷ کو کانپور میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر کے سامنے اور جے بہادر سنگھ نے لکھنؤ اسمبلی کے باہر بھوک ہڑتال پر بیٹھنے کا اعلان کر دیا۔ انتظامیہ کے افسران بھوک ہڑتال ختم کرانے کی کوشش کرتے رہے مگر دونوں شیدائے اردو اپنے مطالبے کے آگے کچھ بھی سننے کے روادار نہیں تھے۔ وہ بالکل نہیں جھکے نہیں اور اپنے مطالبے پر قائم رہے۔ سرکار بھی بڑی ضدی نکلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دس روز کے بعد یعنی ۳۱ / مارچ ۱۹۶۷ کو پنڈت دیونرائن پانڈے کی موت ہو گئی اور اس کے کچھ دنوں کے بعد جے بہادر سنگھ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اردو تحفظ کی تاریخ میں ایسا کوئی اور نام نہیں ملتا جس نے اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے نام پر جان کی قربانی دی ہو۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہم نے بہت جلد ان دونوں مجاہدین اردو کی قربانیوں کو فراموش کر دیا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ "عالمی یوم اردو" کے ساتھ ساتھ ۲۰ / مارچ کو "یوم تحفظِ اردو" کے طور پر بھی منایا جائے۔ یہ ہمارا اخلاقی اور ادبی فریضہ ہے۔ کیونکہ اردو مسلمانوں کی قطعی جاگیر نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس کی ترقی، بقا اور تحفظ میں سبھی کا خون پسینہ شامل ہے۔ لہٰذا ہمیں بلا تفریق مذہب وملت سبھی کی قربانیوں کو یاد کرنا چاہئے اور اپنے شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنی چاہیے۔ یہ ہم سب کی ذمے داری ہے۔

گذشتہ شمارے کی اشاعت سے عین قبل ماہر سرسیدیات پروفیسر اصغر عباس کے انتقال کی دلدوز خبر موصول ہوئی تھی۔ ابھی پروفیسر اصغر عباس جیسے عظیم مربی کی جدائی کا زخم مندمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ لکھنؤ کے بزرگ وکہنہ مشق شاعر محترم رباب رشیدی بھی فانی دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ افسوس یہ غم بھی ہمیں سہنا تھا۔ یہاں کے شعر وادب پر یہ ایک کاری ضرب ہے۔ رباب رشیدی نے نئی نسل پر اپنے گہرے اور نقیس اثرات مرتب کیے تھے۔ یہ خبر دیتے ہوئے جان حلق تک آ رہی ہے کہ ممتاز شاعر، زبان داں اور سہ ماہی ادبی نشیمن کے ادبی مشیر جناب رفعت عزمی طویل علالت کی تاب نہ لا کر ۲۲ / اکتوبر کو زندگی کی جنگ ہار گئے۔ رفعت عزمی کی رحلت ادبی نشیمن کنبہ کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے، جس کی ٹیس ہمیں دیر تک محسوس ہوتی رہے گی۔ عزمی صاحب کا آبائی وطن ردولی (فیض آباد) تھا۔ آپ ردولی کی تاریخ پر ایک تحقیقی کتاب تیار کر رہے تھے، اس کی پروف ریڈنگ بھی ہو چکی تھی۔ مگر افسوس ان کی زندگی میں یہ کتاب پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ اس کتاب کے علاوہ بھی عزمی صاحب نے اپنے مضامین اور غزلیات کے مجموعے کا کام مکمل کر لیا تھا۔ یہ سبھی کتابیں جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوں گی تاکہ ان کے خواب کی تکمیل ہو سکے۔ سردست ان تینوں بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے زیر نظر شمارے میں احمد ابراہیم علوی، رضوان فاروقی ڈاکٹر غلام حسین اور محترم فرید بلگرامی کا ایک ایک مضمون بطور تعزیت شامل کیا جا رہا ہے۔ ادارہ ادبی نشیمن ان سبھی ہنرمندوں کی درجات کی بلندی کے لیے دعا گو ہے۔ قارئین سے بھی جملہ مرحومین کی مغفرت کے لیے دعا کی درخواست گذار ہے۔

ادبی نشیمن کا یہ شمارہ اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ اب نذر قارئین ہے۔ ہمیں آپ کی بیش قیمت اور تنقیدی آراء کا انتظار رہتا ہے۔ امید ہے آپ اس شمارے کو بھی حسب سابق اپنی محبتوں سے نوازیں گے اور ہمیں ہماری کمیوں کی طرف متوجہ کریں گے تاکہ ہم مزید بہتری کے ساتھ اگلے شمارے میں پھر حاضر ہو سکیں۔

شکریہ

ڈاکٹر سلیم احمد

اردو کی نشوونما میں فارسی اور تاجکی زبان کا رول

پدم شری پروفیسر رجبوف حبیب اللہ

(سابق چیرمین شعبہ اردو ہندی، تاجک نیشنل یونیورسٹی، دوشنبہ، تاجکستان)

اردو زبان ہندوستان اور پاکستان میں وسیع پیمانے پر بولی جانے والی ہند آریائی زبان کے گروپ کی نئی زبان ہے۔ ان مشرقی ریاستوں میں جن کی سرحدیں ہیں یا ہندوستان اور پاکستان کے قریب ہیں، اسی طرح جرمنی، انگلینڈ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، آسٹریلیا اور دیگر ممالک میں اردو ان مہاجرین کی مادری زبان ہے جو ان ممالک میں ہجرت کر چکے ہیں۔ مختلف اوقات میں عوامی جمہوریہ بنگلہ دیش میں بہار کے لوگ (وہ لوگ جو ہندوستان کے اس حصے میں منتقل ہونے پر مجبور ہوئے تھے، جسے ملک کی تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان کہا جاتا تھا) بھی اردو بولتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو بولنے والے بنیادی طور پر اتر پردیش، بہار، کشمیر، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر جیسی ریاستوں کے ساتھ ساتھ دہلی اور اس کی مضافاتی بستیوں میں رہتے ہیں۔ اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی منظور شدہ 22 سرکاری زبانوں میں سے ایک ہے۔

اردو زبان میں، اگرچہ ہندوستان اور پاکستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں بعد میں ظاہر ہوئی لیکن خاص طور پر جزیرہ نما ہندوستان میں بے حد مقبول ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں، جسے زبانوں کا میوزیم سمجھا جاتا ہے، کسی دوسری زبان کا ظہور اور اس کا خصوصی درجہ حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ کیا وجہ تھی کہ ہندوستان میں قرون وسطیٰ میں اردو کے نام سے ایک اور نئی زبان وجود میں آئی؟ اس نئی زبان کے وجود میں آنے کی متعدد وجوہات ہر غور کیا جانا چاہیے۔

کئی صدیوں سے، تاجر، مسافر، سائنس داں اور دوسرے پیشوں سے وابستہ لوگ وسطی ایشیا، افغانستان، ایران اور عرب ممالک سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں آئے۔ ان میں سے کچھ، جو یہاں رہ گئے، نے کچھ حد تک کوشش کی کہ وہ اپنے ہی کپڑے پہنیں اور اپنی زبان کو اپنے درمیان رکھیں۔ اس طرح کی ہجرت کے نتیجے میں قدرتی طور پر فارسی تاجکی زبان جو کہ ان کی مادری زبان تھی، ہندوستان میں بھی ان کے ساتھ تبدیل ہوگئی۔ اور یہ سب عمومی طور پر ہر سال ترقی کرتی نظر آئی۔ اور اس کے ساتھ ہندوستان کے ثقافتی رشتوں کو وسعت، کشادگی اور مضبوطی بھی ملی۔ نیز دگر ذکر کردہ ممالک سے رشتے بھی مضبوط ہوئے۔ تاہم، فارسی-تاجکی زبان کے پھیلنے اور درمیانی دور میں ہندوستان کی زبان اور ثقافت پر اس کے اثرات کی دیگر وجوہات ہیں۔ یہ بنیادی طور پر ہندوستان میں فارسی-تاجک ممالک کی فوجی مہمات ہیں، جن کا مقصد اس ملک کی دولت پر قبضہ کرنا اور لوٹنا تھا۔ مسلمانوں کی طرف سے منظم طریقے سے لوٹ مار کے حملے کئی صدیوں سے دیکھے جا چکے ہیں۔ یہ سب کچھ سلطان محمود غزنوی (971-1030)، علاؤالدین محمد شوہی ہلجی (1266-1316)، نادر شاہ (1688-1747) اور عظیم مارگولس کی جارحانہ مہمات میں واضح طور پر دیکھا گیا ہے جنہوں نے ہندوستان میں 1516 سے 1857 تک حکومت کی۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں جاگیردارانہ ہندوستان میں 70 سے زیادہ آزاد ریاستیں اور حکمران تھے، جو ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل جنگ کرتے رہتے تھے۔

ان سب نے قدرتی طور پر ان کی سیاسی، عسکری اور اقتصادی طاقت کو کمزور کیا۔ نتیجتاً، وہ بیرونی فاتحوں کا بھرپور مقابلہ نہ کر سکے اور جلد ہی اپنی آزادی کھو بیٹھے۔ قرون وسطی میں مسلمانوں نے بار بار ہندوستان پر حملہ کیا اور اس کے شمالی حصے کو فتح کیا۔ ایک سلطان محمود غزنوی نے شمالی ہندوستان پر 17 بار حملہ کیا اور ملک کے اس حصے کو لوٹ لیا۔ سلطان علاؤالدین کے دور حکومت میں (1296-1316) بہت زیادہ توسیع کی گئی اور فارسی - تاجکی زبان کو ان علاقوں کی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا گیا جو اس کے زیر اقتدار تھے۔ اس طرح، غیر ملکیوں کے ذریعے فتح کیے گئے ان علاقوں میں، یعنی تیرہویں صدی میں شمالی ہندوستان میں ایک ریاست تھی، جسے "سلطنت دہلی" کہا جاتا تھا۔ سلطانوں نے دہلی کو اپنا دارالحکومت منتخب کیا۔ دہلی کی سلطنت 1206 سے 1526 تک قائم رہی۔ سولہویں صدی کے آغاز سے ہی ہندوستان نے مغلوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ 1526 میں وسطی ایشیا سے بابر نے اپنی فوج ہندوستان کی طرف بھیجی اور جلد ہی دہلی شہر کو فتح کر لیا۔ اسی واقعہ سے ہندوستان کے فاتح مغل بن گئے۔ ہندوستان کی مزید تاریخ ان سے جڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے اپنی ریاست بنائی جسے تاریخ میں "مغل سلطنت" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مصنفین اور تاجروں سے لے کر اپنی فوجوں کے ساتھ فاتحین تک ہندوستان آنے والے تمام مہمان بنیادی طور پر محنت اور لگن والے لوگ تھے۔ یاد رہے کہ یہ تمام زبانیں صرف ناموں میں مختلف ہیں، الگ نہیں۔ انہوں نے ہی فارسی تاجکی زبان کو ہندوستان منتقل کیا۔ ہندوستان میں تاجک زبان اور ادب اگرچہ ان دنوں یہ لفظ فارسی کے نام سے جانا جاتا تھا، لیکن ہندوستان کے فاتحین کی زبان اس وقت فارسی کہلاتی تھی۔ تاہم، یہ واضح رہے کہ یہ فارسی زبان وہی فارسی تھی، جواب فارسی اور تاجکی کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ آنے والے مسلمانوں نے مقامی آبادی میں فارسی زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے مقامی باشندوں کو مختلف طریقوں سے فارسی زبان کی باریکیوں اور امکانات سے آشنا کرنا شروع کیا۔ اس طرح ہندوستان میں اردو زبان کے ظہور میں فاتحین، تاجروں اور مسافروں کا اہم کردار رہا۔ ہندوستان میں اردو زبان کا ظہور اور ترقی آٹھویں صدی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ دور ہے جب 711 میں عربوں نے سندھ پر قبضہ کیا تھا۔ تاہم، یہ کہا جانا چاہئے کہ اس کے بغیر بھی، اس حقیقت کی وجہ سے کہ سندھ کی سرزمین سے ہندوستان کی سرحدیں صدیوں سے ایران کے ساتھ ملتی تھیں، فارسی زبان کا ہندوستان کی ثقافت پر خاصا اثر تھا، جس میں وہاں کے باشندوں کی زبان بھی شامل تھی۔ ایران کے ساتھ سرحدی علاقہ تاہم، یہ اثر اتنا زیادہ نہیں تھا کہ ہندوستان کے دیگر حصوں میں فارسی زبان کے پھیلاؤ کا سبب بنے۔ اس طرح ان دنوں فارسی زبان کا اثر سندھ کے علاقوں تک محدود تھا۔

بہر حال، ہندوستان میں اردو زبان کا ظہور اور نشوونما ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا کے باشندوں کے ہندوستان کے گہرے دوروں کے وقت سے شروع ہوتی ہے، جو اپنی زبان اور ثقافت کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ ہند مسلم ثقافت کا نتیجہ ہے۔

دہلی سلاطین اور مغلوں کے دور میں اردو زبان کی تیز رفتار ترقی یقینی طور پر دیکھی جاتی ہے۔ شروع میں مسلمانوں کو جس مقامی زبان کا سامنا کرنا پڑا، بشمول مسلمانوں کو فتح کرنے والے، وہ کھڑی بولی تھی۔ یہ کھڑی بولی تھی جسے مسلمانوں نے مقامی آبادی کے ساتھ بات چیت کے لیے منتخب کیا تھا۔ کھڑی بولی میں اس ابلاغ کے

نتیجے میں متعدد فارسی - تاجکی الفاظ شامل ہوئے۔ کھڑی بولی کے الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کے معاملے میں فارسی مسلم حکمرانوں نے اہم کردار ادا کیا۔ فارسی زبان مسلمانوں کے دور حکومت میں سرکاری زبان بن گئی۔ اور اسی زبان میں ہندوستان میں فارسی زبان کا ادب پروان چڑھنا شروع ہوا۔ بعد میں اس ادب کی بدولت اردو زبان و ادب تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ پھر اردو زبان و ادب نے جلد ہی ہندوستان کی دیگر زبانوں اور ادبیات میں ایک قابل قدر مقام حاصل کر لیا۔ یاد رہے کہ "ہندی" اور "ہندوستان" کے الفاظ مسلمانوں نے ایجاد کیے تھے اور یہ کھڑی بولی اور ملک کے نام کے لیے استعمال ہوتے تھے، جسے "بھارت" کہا جاتا ہے، اس صورتحال میں مقامی آبادی کے کچھ لوگوں نے کھڑی بولی کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لیے فارسی زبان کے الفاظ استعمال کرنے سے انکار کر دیا اور سنسکرت کے الفاظ کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ کھڑی بولی کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کی خواہش اور سنسکرت الفاظ کے استعمال کی وجہ سے کھڑی بولی ہندی کے نام سے مشہور ہوئی۔ ہندی زبان (کھڑی بولی) سنسکرت زبان کی براہ راست اولاد ہے۔ سنسکرت سے ہندی کو دیوناگری نامی ایک اسکرپٹ وراثت میں ملا اور یہ اسکرپٹ آج تک استعمال ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کھڑی بولی بولنے والے مقامی آبادی کا ایک اور حصہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرتا رہا اور آہستہ آہستہ کھڑی بولی کے الفاظ کو فارسی الفاظ سے بھرتا رہا۔ پھر فارسی الفاظ سے مالا مال ہوتا رہا۔ اس طرح رفتہ رفتہ کھڑی بولی کو اردو کہا جانے لگا، اور حروف تہجی نے عربی رسم الخط کا انتخاب کیا۔ اردو زبان کی نشوونما کا عمل بہت دلچسپ ہے۔ جن مسلمانوں نے ہندوستان کا دورہ کیا، اور یہاں عارضی یا مستقل طور پر مقیم تھے، ان میں سے زیادہ تر فوجی تھے۔ ان کے محل وقوع اور آباد گاہوں کو اردوگاہ (فوجی یونٹوں کی طرح) کہا جاتا ہے۔ یہ فوجی یونٹ ایک وقت میں تجارت کے مقامات تھے، جو کہ ایک بازار کے طور پر کام کرتے تھے۔ ایسے بازاروں میں جو فوجی یونٹوں کی سرزمین پر واقع تھے، یہاں تجارت ہندوستانیوں کے درمیان ہوتی تھی، ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے درمیان بھی۔ رفتہ رفتہ اس طرح کے بازاروں میں استعمال ہونے والی زبان کو اردو کہا جانے لگا۔ ایسی اردوگاہ پہلی عوامی جگہ تھی جہاں ایک نئی زبان اردو کی علامات کا مشاہدہ ممکن تھا۔ یہ علامات فارسی اور کھڑی دونوں زبانوں کے الگ الگ الفاظ، فقرے اور سادہ جملوں کا استعمال تھیں۔ نتیجتاً اردوگاہ نے اردو زبان کی نشوونما اور اس کے ظہور میں اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، دو زبانیں ہندی اور اردو، نئی ہندوستانی زبانوں کے طور پر، کیونکہ ان میں بہت کچھ مشترک ہے، انہیں "ہندوستانی" کہا جاتا تھا اور بولی جانے والی زبان کی شکل اختیار کر لی جاتی تھی۔ شروع میں، ان زبانوں کے درمیان ایک اہم فرق نظر آتا ہے۔ جسے آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا، دو

مختلف قسم کی تحریر کا استعمال تھا، یعنی ہندی کے لیے دیوناگری تحریر اور اردو کے لیے عربی حروف تہجی۔ جہاں تک گرامر کا تعلق ہے تو ان زبانوں میں کوئی فرق نہیں تھا اور اب بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں زبانوں کی قواعد کی ساخت ایک جیسی ہے۔ البتہ لکھنے کے علاوہ دونوں زبانوں کی لغت میں فرق ضرور ہے۔ اردو زبان کا ذخیرہ عربی اور فارسی الفاظ سے بھرا پڑا ہے، اور ہندی زبان کا ذخیرہ الفاظ سنسکرت کے الفاظ ہیں۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ فارسی زبان میں اردو میں بغیر کسی رکاوٹ کے ایسے عربی الفاظ شامل ہیں جو فارسی زبان میں ایسے داخل ہو گئے ہیں جیسے یہ دراصل فارسی کے الفاظ ہوں۔ فارسی تاجکی الفاظ اردو میں داخل ہوئے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی بنیادی اہمیت برقرار رکھی ہے، تاہم کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں کہ اردو نے اپنی اصل قدر کھو دی ہے۔ اس کے ایک مختلف معنی نکالے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، لفظ "شودی" (خوشی)، جسے اردو زبان میں "شادی" کہا جاتا ہے، اور زیادہ تر "شادی" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ سے لفظ "شادی شودا" بنا جس کا مطلب ہے "شادی شدہ"۔ اردو میں استعمال ہونے والے تقریباً ساٹھ فیصد الفاظ فارسی (تاجکی زبان) سے لیے گئے ہیں۔ اس حقیقت کی تصدیق کرنا بہت آسان ہے۔ اردو میں محمد اقبال کے اشعار کی یہ سطریں ہیں: کیا چرخی کجرو، کیا مہر، کیا مہ؟ (ایک زگ زیگ چلتا ہوا پہیہ کیا ہے، سورج کیا ہے، چاند کیا ہے؟)، سب رہو وہ، واماندائی راہ (سڑک سے تھکے ہوئے تمام مسافر)۔ کرکا سکندر بجلی کی مانند، (سکندر بجلی کی طرح گرجتا ہے) تجھے کو خبر ہی، آیا مرگی نگاہ؟ (جانتے ہو حادثاتی موت) نادر نی لوٹی دلی کی دولت، (نادر نے دہلی کی دولت لوٹ لی) یک غربی شمشیر، افسانہ کتہ۔ (اس کی تلوار کا ایک وار اور کہانی کا اختتام)۔ اقبال کا ایک شعر، جو اردو میں "کلیات اقبال" میں شامل ہے، اگر اردو میں تلفظ کو مدنظر نہ رکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تاجک زبان میں یہ چاروں التوا ہیں: جمالی عشق مستی نیوازی۔ محبت اور نشہ - پائپ کا کھیل) جلالی عشق مستی بینیازی (محبت کی عظمت اور نشہ-ضرورت کی کمی)۔ کمالی عشق مستی ظرف حیدر (عشق اور نشہ کی چوٹی - حیدر کی فطرت) ذوالی عشق مستی حرفی رازی (محبت کا غروب اور نشہ لفظ رضامندی)۔

اب کچھ کہاوتیں دیکھیں، جو مذکورہ بات کی مزید تصدیق کرتی ہیں: آگ کے لیے خوشکوتار برابر ہے (آگ کے خشک اور کچے میدانوں سے پہلے)۔ گرگ بارندیدہ وہ (سب جاری بھیڑیا)۔ اب خدا کی ذات بنو (عیبوں کے بغیر-صرف خدا)۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، اردو زبان میں فارسی-تاجک الفاظ کا استعمال بہت زیادہ ہے، جو بلاشبہ اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے کہ فارسی-تاجک زبان اردو زبان کی ماں ہے۔ رفتہ رفتہ، نئی زبان اردو فوجی کیمپوں (اردوگاہ) کے گھیرے سے نکل کر وسیع پیمانے پر پھیلنے لگی۔ اپنی سریلی آواز اور میٹھی آواز کی وجہ سے یہ زبان تیزی سے ترقی کرنے لگی اور ایک

ایسی زبان بن گئی جو سب کی زبان بننے کے قابل ہوگئی۔ تکرار اور سائنس کی زبان اردو کی ترقی یافتہ زبان میں بعد میں مذہبی، فلسفیانہ اور فنی کاموں کی تصنیف شروع ہوئی۔ اردو زبان سب سے پہلے ہندوستان کے شمال میں خاص طور پر دہلی شہر میں پروان چڑھی، پھر جب علاو الدین خلجی نے ہندوستان کے جنوبی حصے پر قبضہ کیا تو وہاں پھیلنا شروع ہوا اور اسے "دکنی" یعنی "جنوبی" کہا جانے لگا۔ اردو زبان بطور ادبی زبان، بنیادی طور پر XVIII - XVI صدی میں تیار ہوئی، پہلے ہندوستان کے جنوب میں پھر شمال میں۔ 18ویں صدی کے دوسرے نصف کے آس پاس شمالی ہندوستان میں فارسی بولنے والے شاعروں نے پوری طرح اردو میں لکھنا کرنا شروع کیا۔ کچھ دنوں بعد یہ اور آگے بڑھی۔ اردو میں نثری کام ہوا جو پہلے تقریباً نہیں دیکھا گیا تھا۔ جب سے اردو زبان کو "ایسٹ انڈیا کمپنی" (1832) کی سرکاری زبان قرار دیا گیا، اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور اس زبان میں ادب تیزی سے ترقی کرتا رہا۔ اور انیسویں صدی میں ہندوستان کی دیگر زبانوں اور ادب کے درمیان اردو زبان اور ادب نے ایک خاص اور مضبوط مقام حاصل کرلیا۔ اور اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے جلد ہی ہندوستان کے مختلف شہروں بشمول دہلی اور لاہور جیسے بڑے شہروں میں اردو زبان میں اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے۔ اس طرح اردو زبان و ادب ہندوستان کے شمالی اور جنوبی علاقوں میں پھیلنا شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں درجنوں ادبی حلقے، مراکز اور مکاتب قائم ہوئے، جس کے نتیجے میں ہندوستان کی دیگر زبانوں اور ادب کے درمیان اردو زبان و ادب کے وقار میں اضافہ ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف اسکولوں میں اردو کی تعلیم دی جانے لگی۔ دونوں ممالک میں اردو میں سینکڑوں ادبی، ثقافتی، اقتصادی، طبی اخبارات اور رسائل شائع ہونے لگے اور آج بھی شائع ہوتے ہیں۔ اردو میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے بے شمار پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں اردو زبان کا ایک خاص اثر اور بے شمار بولنے والے اور مداح ہیں۔ ہندوستان میں فارسی زبان کے ادب کے زیر اثر اردو میں ایسا ادب شائع ہوا، جس کی عالمی شہرت ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز ادیب وشاعر جیسے مرزا اسد اللہ غالب (1797-1869)، محمد اقبال (1877-1938)، فیض احمد فیض (1911-1984)، پریم چند (1880-1936)، کرشن چندر (1917-1974) سعادت حسن منٹو (1912-1955)، حفیظ جالندھری (1900-1982) اور سینکڑوں دوسرے نے اردو میں لازوال تخلیقات لکھیں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم بھی ہوئے۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، اردو زبان، جو ہند مسلم ثقافت کی ترکیب کے نتیجے میں نمودار ہوئی ہے، لاکھوں لوگ صدیوں سے ہندوستان، پاکستان اور اس سے آگے ایک آزاد، ترقی یافتہ اور مضبوط زبان کے طور پر اردو کو استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ اردو کی بڑی طاقت کہی جائے گی کہ آج بھی عوام کے دلوں پر راج کرتی ہے۔

(انگریزی سے اردو ترجمہ: ڈاکٹر مشتاق صدف)۔

خطیبؔ گلشن آبادی کی غزل گوئی

ڈاکٹر نارائن پاٹیدار

(شعبۂ اردو، بھگت سنگھ گورنمنٹ پی جی کالج، جاؤرا، ضلع رتلام (ایم پی)، پن:457226، موبائل:8305065238)

خطیبؔ گلشن آبادی کا اصل نام غلام ربانی اور خطیبؔ تخلص تھا۔ ان کی ولادت جاؤرہ میں ۱۹۱۵ء میں ہوئی اور ایک طویل عمر گزارنے کے بعد ۲۰۰۶ء میں وہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ ان کے دادا امانت اللہ امانتؔ نواب اسماعیل خاں کے عہد میں ریاست جاؤرہ کے میر منشی تھے۔ جاؤرہ کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی شاعرانہ صلاحیت کے متعلق پروفیسر وسیم الدین تحریر فرماتے ہیں:

"امانتؔ ریاست میں میر منشی تھے ہر صنف سخن پر قادر تھے۔ غزل، گیت، ٹھمریاں، مرثیہ، قصیدوں کی بڑی تعداد ان کے غیر مطبوعہ کلام میں ملتی ہے۔ ان کا کلام محاسن شعری سے مملو ہے۔"

(جاؤرہ میں اردو زبان وادب: پروفیسر وسیم الدین، بشمول مدھیہ پردیش میں اردو زبان وادب-مرتبہ- پروفیسر آفاق احمد، سنہ اشاعت ۱۹۹۶ء، ص نمبر ۱۵۱-۱۵۲)

خطیبؔ صاحب کے والد منشی کفایت اللہ کفایتؔ بھی اپنے عہد کے بڑے عالم تھے اور شاعری میں اعلیٰ فضیلت کے مالک تھے۔ انھیں مختلف زبانوں پر دسترس حاصل تھا۔ ان کے متعلق پروفیسر سید حیدر عباس رضوی رقم طراز ہیں:

"امانت کے صاحبزادے منشی کفایت اللہ کفایتؔ اپنے زمانے کے ممتاز صاحب علم تھے۔ انھیں ولی عہد ریاست اور ان کے برادران کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ اردو، عربی اور فارسی زبانوں پر انھیں کامل عبور تھا اور انگریزی میں اچھی دست گاہ رکھتے تھے۔ شاعری میں ان کی توجہ قصیدہ اور نظم کی اصناف پر مرکوز تھی۔"

(بحوالہ۔ قطرہ قطرہ خون۔ از۔ خطیبؔ گلشن آبادی، اشاعت اول ۱۹۹۲ء، ص نمبر ۴)

خطیبؔ گلشن آبادی کو بچپن سے ہی علمی وادبی ماحول ملا جس کا اثر یہ ہوا کہ شاعری جو انھیں وراثت میں ملی تھی ان کی طبیعت میں سرایت کر گئی بعد ازفخر مالوہ حضرت شاداںؔ اندوری کے مفید مشوروں سے ان کی شاعرانہ صلاحیت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ ابھی تک خطیبؔ گلشن آبادی کے چار شعری مجموعے شائع ہو کر شہرت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "قطرہ قطرہ خون" ہے جو ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ۷۵ منتخب غزلیں شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ "مشاہدہ" ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ۹۹ منتخب غزلیں شامل ہیں۔

تیسرا شعری مجموعہ جو حمد ،نعت ،منقبت اورسلا م کا انتخاب ہے۔ ''نذرانہ'' کے عنوان سے جنوری ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔ موصوف کا چوتھا اور آخری شعری مجموعہ ''محامد باری تعالیٰ'' کے عنوان سے ۲۰۰۳ء میں چھپا۔ یہ مجموعہ حمد ،نعت ،قطعہ ،رباعی اور مناجات وغیرہ کا انتخاب ہے ۔اس مجموعہ میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی کلام بھی موجود ہے۔

خطیبؔ گلشن آبادی قادرالکلام شاعر تھے ۔انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کے شعری مجموعوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موصوف نے حمد وغزل گوئی پر زیادہ توجہ دی ہے اوران کے یہاں حمدوں اورغزلوں کی تعداد زیادہ اور زوردار ہیں ۔پروفیسر سید حیدر عباس رضوی نے بجا فرمایا ہے:

"خطیبؔ صاحب نے اگر چہ دیگر اصناف شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل گوئی ان کا خاص میدان ہے۔ان کا کلام فکروفن ہر دو لحاظ سے پختہ ہے ۔جاؤرہ (گلشن آباد)میں بجاطور پر انھیں اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔"

(بحوالہ۔قطرہ قطرہ خون از خطیب گلشن آبادی ،اشاعت اول ۱۹۹۲ء،ص نمبر ۹)

خطیبؔ گلشن آبادی جدّت پسند شاعر تھے وہ طرز ادا کی جدت سے معمولی سی بات کو غیر معمولی بنا کر اس میں لطف واثر پیدا کرنے کا ہنر خوب جانتے تھے ۔ان کی غزلوں میں اس سے متعلق مثالیں موجود ہیں۔ ؎

گل چیں کی نظر سے بچ کر بھی گلشن میں رہے تو کیا حاصل
پھولوں کی حیات دوروزہ کانٹوں میں بسر ہو جاتی ہے

ہم نے خطیبؔ اپنی ہی غرض کے سانچے میں ان کو ڈھالا ہے
بن کے صنم بدنام ہوئے ہیں مفت میں یہ بیچارے پتھر

پوچھا تھا ایک شخص سے گھر کا ترے پتا
کتنے فسانے شہر میں مشہور ہو گئے

اپنے صیاد کی دیکھ کر بے بسی
سر جھکائے ہوئے زیر دام آ گئے

ان کی تصویر کیا نظر آئی
آئینہ بن کے رہ گیا ہوں میں

مذکورہ بالا اشعار کے ہر شعر میں موصوف نے موجودہ منتشر خیالات کو ایک خاص ترتیب سے پیش کیا ہے جس سے شعر کا مخصوص خیال نہ صرف تازگی سے بھرپور ہے بلکہ اس میں ایک نئے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے جو جدت بیان کا تقاضا ہے۔

ناقدین کے مطابق دنیا کی بیشتر شاعری کے بنیادی موضوع جذبۂ عشق و جنگ رہے ہیں اور الگ الگ شاعروں نے انھیں الگ الگ زاویوں سے پیش کیا ہے ۔اردو کے اہم غزل گو شعرا کے یہاں بھی عشقیہ موضوعات بڑی تعداد میں موجود ہیں ۔ خطیبؔ گلشن آبادی کی غزلوں میں عشق کے حسین اور نازک جذبات اس طرح پیش ہوئے ہیں۔ ؎

کسی کی زلف جب بکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے
خیالوں میں بڑی پیچیدگی معلوم ہوتی ہے

امید یہ رکھتے ہیں ہم جذب محبت سے
جب آنکھ ملے ان سے اک تازہ پیام آئے

تمہاری ذات بھی میری نظر کا مرکز ہے
تمہارا حسن ہی کچھ حاصل نگاہ نہیں

بمشکل ان سے دو باتیں ہوئی تھیں زندگی بھر میں
سراپا راز بن کر رہ گئی ہے زندگی میری

بے خبر آغاز سے نا آشنا انجام ہے

کام رکھتا ہے دلِ ناکام اپنے کام سے

موصوف کا عشق اوروں سے منفرد ہے۔ دور انھوں نے خود ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

چلتا ہوں بچ کے اوروں کے نقش قدم سے میں
ہوں رہ نورد عشق مگر کارواں سے دور

وہ عشق کی عظمت ،افادیت و اثر سے بخوبی واقف تھے اپنے خاص انداز میں فرماتے ہیں۔ ؎

جس کو اسرار دو عالم کی خبر ہوتی ہے
وہ نظر صرف محبت کی نظر ہوتی ہے

عشق میں موت سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں
ایک ہی بار شب غم کی سحر ہوتی ہے

بھٹک رہا ہے اندھیروں میں کاروانِ حیات
چراغ دل ہی جلا گر چراغ راہ نہیں

اہل غم کرتے ہیں روشن جس سے منزل کا چراغ
راہِ الفت میں اسے کہتے ہیں ہم دل کا چراغ

زندگی شادو غم کا مجموعہ ہے۔خطیبؔ گلشن آبادی کے یہاں بھی جذبۂ غم موجود ہے، ان کا خیال ہے کہ غم انسان کو ایسے مختلف تجربات سے روشناس کراتا ہے جو زندگی کے لیے سبق آموز ہوتے ہیں ۔غم سے وابستہ اشعار دیکھیے۔ ؎

دل اگر سوز آشنا ہو گا
ہر قدم پر دیا جلا ہو گا

جب سے غم کو گلے لگایا ہے
زندگی نے سکون پایا ہے

درد دل اورزخم جگر
ہم کو دو ہم سفر مل گئے

خطیبؔ گلشن آبادی ایک مشاق شاعر تھے۔انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی انھوں نے اپنی غزلوں میں شاعری کی مختلف صنعتوں کا استعمال بحسن وخوبی کیا ہے۔دعویٰ کی دلیل میں مثالیں پیش خدمت ہیں۔

صنعت تلمیح کی مثالیں دیکھیے۔ ؎

جو داستان طور کی تمہید تھا خطیبؔ
وہ جذبِ شوق اب بھی ہماری نظر میں ہے

کعبہ و دیر وکلیسا سے جو ہٹ کر ہوں خطیبؔ
بہر سجدہ وہ مقامات کہاں سے لاؤں

وہ کلیم جیسی باتیں تو نہ تھیں خطیبؔ اس میں
تمھیں ہم سنا رہے تھے جو کلام بے خودی میں

ایک کعبہ ہے ایک بت خانہ
اف رے دنیا کا شوق افسانہ

تضمین المزدوج اور ذوالقوافی کی مثالیں ؎

دل کی ہستی راز بھی ہے آشنائے راز بھی
خود شکستہ ساز بھی ہے خود صدائے ساز بھی

جو اپنی نگاہوں کی تقصیر سمجھتے ہیں
وہ آپ کے جلوؤں کی توقیر سمجھتے ہیں

نظر حجاب تو چہرہ نقاب مانگے ہے
شباب ایک نیا انقلاب مانگے ہے

وضاحت: مذکورہ اشعار کے ہر شعر میں دو دو قافیے استعمال ہوئے ہیں۔

تضاد کی مثالیں ؎

اک نظر زیست کے آداب سکھاتی ہے ہمیں
اک نظر موت کا پیغام ہوئی جاتی ہے

نہ جانے خوشی کے ہیں یا غم کے آنسو
بظاہر ہر اک آنکھ تر ہو رہی ہے

وضاحت :پہلے شعر میں زیست و موت اور دوسرے شعر میں خوشی وغم میں تضاد ہے۔

طباق سلبی کی مثال ہے ؎

دست ساقی دراز ہو کہ نہ ہو
خواہش بادہ خوار باقی ہے۔

وضاحت: ہو اور نہ ہو میں تضاد ہے اور یہ دونوں ایک ہی مصدر سے مشتق ہیں حرف نفی "نہ" ایک میں جڑا ہوا ہے۔

تکرار یا تکریر کی مثالیں ؎

گریباں چاک بھی کیجے رفو بھی

مگر دور خزاں دور خزاں ہے
جب جہاں کا درد بھی شامل ہوا
پھر ہمارا دل ہمارا دل ہوا
کلی کلی کی زباں پر تھا میرا افسانہ
الجھ الجھ کے جو دامن سے خار زار چلے

وضاحت: پہلے شعر میں دور خزاں دور خزاں ،دوسرے شعر میں ہمارا دل ہمارا دل اور تیسرے شعر میں کلی کلی اور الجھ الجھ مکرر آیا ہے۔

تکریر مع الوسائط کی مثالیں ۔

لاکھ دھوکا سحر کا ہو لیکن
ہر سحر تو سحر نہیں ہو تی
گر نظر ان کے جلوؤں سے معمور ہے
برق ہی برق ہے ،طور ہی طور ہے

وضاحت: پہلے شعر میں سحر اور سحر کے درمیان ''تو'' کا لفظ اور دوسرے شعر میں برق برق اور طور طور کے درمیان ''ہی'' کا لفظ تکریر مع الوسائط ہے۔

تفریع کی مثال ۔

نام ساقی لیتے لیتے بادہ کش غافل ہوئے
ہوش میں آئے تو نکلا منہ سے پیمانے کا نام

وضاحت: شعر کا پہلا اور آخری لفظ (نام) یکساں ہے۔

ردالعجز علی الصدر کی مثال ۔

یہ بہک کر پینے والوں کا طریقہ ہو تو ہو
اور ہو سکتا ہے کیا پی کر بہک جانے کا نام

وضاحت: صدر میں آیا لفظ ''بہک'' عجز میں بھی استعمال ہوا ہے۔

جمع کی مثال ۔

ہجوم یاس، بے چینی، فراق و درد، ہجر و غم
چلی ہے ساتھ لے کر شوق کی بارات تنہائی

وضاحت: اس شعر میں سفر محبت کے ساتھ ہجوم یاس، بے چینی، فراق و درد اور ہجر و غم کو جمع کیا گیا ہے۔

موصوف نے ایہام کو بھی اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے مثال کے طور پہ چند اشعار دیکھیں ۔

توڑ کر ایک دام کو ہم آ گئے پھر دام میں
دام چھوٹا ہم سے لیکن ہم نہ چھوٹے دام سے
ہمیشہ سے اکیلا جل رہا ہوں بزم ہستی میں
میں وہ شمع وفا ہوں جس کے پروانے نہیں ہوتے
جتنے بھی خار و خس تھے مری رہگذار کے
آئینہ حیات کے پر تو سے جل گئے

خطیب گلشن آبادی نے بھرپور زندگی بسر کی وہ زندگی کے مختلف نشیب و فراز سے گزرے تھے جس کا اثر ان کے طویل شعری سفر میں دیکھا جا سکتا ہے خصوصاً ان کی غزلوں میں ان کے عہد کے حالات و حوادث جھلکتے ہیں فرماتے ہیں۔ ۔

انگڑائیاں زمانے کی اللہ کی پناہ
ہر موڑ پر حیات کے نقشے بدل گئے
آنکھوں سے لے کے اشکِ تمنا کا سرخ رنگ
حالات لکھ رہا ہوں غم روزگار کے
خاک چھانی ہے بہت گردش ایّام کے ساتھ
راستے ہو گئے منسوب مرے نام کے ساتھ

آپ جہد آزادی کے چشم دید شاہد تھے آزادی کے حصول میں ہندستانیوں نے جو قربانیاں دی تھیں اس کے متعلق ایک غزل میں یوں اشارہ کرتے ہیں۔ ۔

ہم نے کھیلی ہے خون سے ہولی
جب چمن میں بہار آئی ہے

آزادی کے بعد تقسیم کا جو سانحہ پیش آیا، اس نے آزادی کی خوشی کو ماتم میں بدل دیا۔ موصوف کی شاعری میں اس کا گہرا درد و اثر موجود ہے مثلاً یہ اشعار پیش خدمت ہے۔ ۔

ابھرے تھے انقلاب کے پردے میں جو خطیب
ان ولولوں میں اب کوئی شدت نہیں رہی

کیوں الجھتے ہیں اہل دیر وحرم
کیا یہی رسم و راہ منزل ہے
اسی سے پوچھئے احوال گردش دوراں
جوحادثات الم کاشکار ہوتا ہے
یہ سوچ کر سچ مچ روتا ہوں جب رسمی غم کم ہوتا ہے
فریادوفغاں کے پردے میں تہذیب کا ماتم ہوتا ہے

خطیبؔ گلشن آبادی نے اپنی غزلوں میں دنیا کی بوقلمونی اور زندگی کے اسرار ورموز کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ؎

خطیبؔ اپنوں میں رہ کر سیکھ لی بیگانگی ہم نے
اگر اپنے نہیں ہوتے تو بیگانے نہیں ہوتے

رہ گئی چھپ کے نئے دور کی تاریکی میں
زندگی اپنے خیالات کی تصویر نہیں

نہ جانے کون ساجذبہ ہے جو مجبور کرتا ہے
اٹھا لیتا ہے بار غم خوشی سے آدمی تنہا

تمناؤں کا مسکن بھی وہی تم بھی اسی دل میں
ہزاروں پیچ وخم ہیں زندگی کی ایک منزل میں

قدم زمیں پہ بہت پھونک پھونک کر رکھئے
قدم قدم کا زمانہ حساب مانگے ہے

زندگی ایک فریب ہے پھر بھی
خودفریبی میں مبتلا ہوں میں

خطیبؔ گلشن آبادی سماجی مساوات کے خواہاں تھے وہ سماجی ظلمتوں کا خاتمہ چاہتے تھے ان کی یہ فکر مندی ان کے اشعار میں واضح طور پر نظر آتی ہے ۔ اشعار دیکھیے ؎

ہر سحر آتی ہے لے کر اک چراغ آفتاب
ختم لیکن ظلمت شام الم ہوتی نہیں

اس جہنم زدہ دنیا کو بنا دو فردوس
ایسے رنگین خیالات کہاسے لاؤں

حیات پہ تاریکیاں مسلّط ہیں
چراغ فکر جلاؤ بہت اندھیرا ہے

ذہنوں میں رنگ پستی افکار دیکھ کر
حیراں ہوں اہل ہوش کے کردار دیکھ کر

رہ مے خانۂ حیات کی یہ رسم ہے قدیم
دیتے ہیں جام صورت میخوار دیکھ کر

غرضیکہ خطیبؔ گلشن آبادی کی شاعری میں ایک بانکپن ہے ۔انھوں نے قدیم طرز سخن اور کلاسیکی روایت کی پاسداری اور پیروی تو کی ہے ساتھ ہی شاعری کے جدید تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں فکری تسلسل کی کارفرمائی ہے ۔ان کی ادبی کاوشات تابندگی اور توانائی نیز ادبی محاسن سے معمور ہے خطیبؔ صاحب کے شعری اوصاف کے متعلق پروفیسر آفاق حسین صدیقی کا یہ بصیرت افروز محاکمہ معتبر و مستحسن ہے:

"حضرت خطیبؔ گلشن آبادی علاقہ مالوہ کی ان ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی تمام زندگی اردو زبان کی بقاء کے لیے جدوجہد کرنے ،اردو تہذیب کو عملی طور پر فروغ دینے اور اپنی تخلیقات سے اردو شاعری کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کرنے میں گزاری ہے .....

....حضرت خطیبؔ گلشن آبادی کو جو خصوصیت اس علاقہ کے فنکاروں میں ممتاز کرتی ہے وہ فنی نزاکتوں سے ان کی گہری واقفیت اور کلاسیکی روایات کی پاسداری کے ساتھ جدید رجحانات سے اثرات قبول کر کے نئے تجربات کرنے کی سنجیدہ کوشش ہے۔"

(محامد باری تعالیٰ پر ایک نظر: پروفیسر آفاق حسین صدیقی بشمول محامد باری تعالیٰ از خطیبؔ گلشن آبادی سنہ اشاعت ۲۰۰۳ء ص نمبر ۵)

☆☆☆

ہجور آما: ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر سفینہ بیگم

(گریٹر نوئیڈا، یوپی۔khan.safina5@gmail.com)

اکیسویں صدی میں، اردو ناول نگاری کی روایت میں کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن میں موضوع اور اسلوب دونوں سطح پر بہت سے تخلیقی تجربات سامنے آئے۔ ناول کی تفہیم وتعبیر اور اس کے بعد تنقیدی عمل کا آغاز، متن کی تخلیق کے ساتھ ہی ہوجاتا ہے لیکن ہر ناول کا تعین قدر، پیرایہ اظہار کے طریقوں میں کارفرما عناصر کی شمولیت کے پیش نظر ہوتا ہے جو ناول کو معنی خیز بناتا ہے۔ ناول سب کچھ نہ کہہ کر، بہت کچھ کہہ دینے کا فن ہے، یہ بیان کرنے کا ایسا فن ہے جو قاری کے ادراک کو انگیز کرنے کے ساتھ، اپنے ''بہت کچھ کہنے میں'' بھی غیاب کا عمل پوشیدہ رکھتا ہے۔ جس میں ناول نگار کی فکری صلاحیت اور بصیرت، اظہار و بیان کے مختلف وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے، صورت حال کی کئی جہات کو بالواسطہ طور پر متن میں پھیلاتی اور سمیٹتی رہتی ہیں۔ متن کے اس تشکیلی عمل میں بیان، خود کو کئی حوالوں سے مرتب کرتا ہے جس میں براہ راست اور بالواسطہ کئی عناصر شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں جس قسم کے تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں ان میں، بیان کی سادگی میں، پیچیدگی کی پرتیں نظر آتی ہیں اور یہ پیچیدگی طرز فکر کے ساتھ ساتھ فنی مباحث کے حوالے سے بھی نمایاں صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال شبیر احمد کا ناول ''ہجور آما'' ہے۔ اس ناول میں ہجور آما کے کردار کو بنیاد بنا کر پورے ناول کو تشکیل دیا ہے جس میں بھادی سماج کے افراد کی صورت حال کے پس پردہ، متن میں

سیاسی، سماجی، تاریخی، تہذیبی، نفسیاتی اور اساطیری منظر نامہ خلق کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی دیب لینا اور ارباز کی ناکام داستانِ عشق، بھادی سماج کی توہم پرستی، برسوں سے جاری شمالی بنگال میں گورکھالینڈ تحریک، سیاست میں خواتین کا فعال کردار، مختلف نظریات کی کشمکش کا بیان نیز زمانی سطح پر ماضی بعید کے تاریخی احوال سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ دوسرے ناولوں سے یہ اس طور پر مختلف ہے کہ درج بالا تمام عوامل کو صورت حال سے جس طرح ہم آہنگ کر کے برتا گیا ہے وہ ناول کی زمانی ساخت میں نیا تجربہ ہے۔ جس میں خیال، یاد، چھوٹے چھوٹے فقروں، مکالموں، خود کلامی، خواب، اور منظر سے پیدا ہونے والی کیفیت، صورت حال کی ترتیب میں اس انداز سے کارفرما نظر آتی ہے کہ پلاٹ کے روایتی انداز میں تخریب کا عمل نمایاں ہوجاتا ہے یعنی ترتیب میں تخریب کا عمل اس ناول کا اہم وصف ہے، جس سے واقعات کی گرہ کشائی سلسلے وار نہ ہو کر مختلف جہات سے ممکن ہوتی ہے۔ اس طور سے واقعات کو مستقیمی linear سطح پر بیان نہیں کیا گیا بلکہ صورت حال کے نتائج کی زیریں پرت سے اخذ شدہ احساسات کی بنیاد پر قصے کا آغاز کیا گیا ہے جو پورے ناول کو محیط ہے اور جس میں ہجور آما، ماضی کے دھندلکوں سے یاد کی شکل میں بھادی عورت، موسیقی، بانسری، خواب، سفید ہاتھی، ارباز، ڈائری وغیرہ برآمد کرتی ہیں اور صورت حال کی ابتدا، وسط اور انجام کے آگے جانے اور پیچھے پلٹنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ ناول کے واقعات کو تیئس ۲۳ ابواب کے تحت تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کی ابتدا، کسی شعر سے کی گئی ہے جو اپنی معنوی سطح پر بالواسطہ، اس باب کی صورت حال کو منعکس کرتا ہے۔

ناول میں واحد غائب راوی نے، دیب لینا اور ارباز کے خیالات واحساسات اور یادوں کے حوالے سے محدود نقطہ نظر اختیار کیا ہے جس میں واقعات انھی دونوں کرداروں کے توسط سے ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔اس طریقے کار کو Limited point of view کہا جاتا ہے جس میں واقعات کے بہاؤ میں کردار کی سوچ کا عمل دخل کارفرما ہو،راوی اسی سوچ یا خیالات کے تناظر میں کہانی بیان کرے اورصورت حال متشکل ہوتی نظر آئے لیکن راوی کے بیان کا محور یا مرکز ایک کردار (بعض دفعہ دو بھی ہوسکتے ہیں) ہو۔ناول میں ہجورآما کے کردار کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جب کہ ارباز کے کردار کو تفصیل سے بیان نہ کرکے اس کی زندگی یا شخصیت کے انھی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی اعتبار سے دیب لینا/ہجورآما سے ہے۔خواہ وہ کالج کا زمانہ ہو،یا کالپونگ کا سفر،ارباز کی پروفیسر نظر امانوی کے ساتھ گفتگو ہو یا بصر کا تحقیقی مرحلہ وغیرہ ،ان تمام واقعات کا مرکز ہجورآما ہی ہے۔یہ ناول کا دوسرا اہم وصف ہے۔

ناول میں ہجورآما کے خوابوں کا سلسلہ واقعات کو معنویت عطا کرتا ہے اور بعض مقامات پر صورت حال کی پیش گوئی بھی کرتا ہے، نیز بھادی سماج کے تاریک پہلوؤں کو اساطیری طرز فکر کے حوالے سے بھی بیان کرتا ہے۔اس اعتبار سے غور کیا جائے تو دیب لینا کے یہ خواب ،اس کے اجتماعی لاشعور کا حصہ معلوم ہوتے ہیں،اس قسم کے خواب بھادی سماج کی دیگر خواتین کو بھی آتے تھے،لیکن بھادی عورتوں کے حالات میں بدلاؤ اور خراب صورت حال سے خود کو نکالنے کے بعد یہ خواب آنا بھی بند ہوجاتے ہیں۔ یہاں کئی طرح کے سوال کھڑے ہوتے ہیں پہلا یہ کہ یونگ کے نظریے اجتماعی لاشعور کے مطابق ان خوابوں کا آنا اگر واقعی اجتماعی لاشعور کا حصہ تھا تو کسی قوم کی ترقی اور بہتری سے خوابوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوسکتا بلکہ یہ کسی نہ کسی طور پر انسانی لاشعور میں موجود ہوتا ہے۔دوسرا یہ کہ اگر خوابوں کا یہ سلسلہ ختم ہوچکا ہے تو کیا اس کا تعلق،کرداروں کے ذہن میں پروان چڑھنے والی بھادی سماج کی فلاح و بہبود سے تھا؟ اور اسی وجہ سے راوی نے جا بہ جا، پہاڑ کی سیاست اور بھادی قوم کے ذہنی رویوں کی بنیاد پر،صورت حال کو ان حوالوں سے تشکیل دیا اور صورت حال کے بہتر ہوجانے پر،خواب کے بیان کو غیر ضروری سمجھا؟۔مزید یہ کہ خود کوشیو کے شراپ سے شاپت قوم سمجھنے والے یہ لوگ، دیپ لینا کے ایک جھوٹ کے سبب،اگر شراپ سے آزاد تسلیم کر لیتے ہیں تو کیا اس حوالے سے اساطیر کا بیان بے معنی ہوجاتا ہے؟۔دراصل یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے خارجی عوامل ومحرکات، اس کی فکری صلاحتیوں اور ذہنی رویوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جہاں ایک طرف،توارث اور ماحول کسی شخصیت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں،وہیں دوسری جانب،انسانی شعور جس نہج پر اپنی سائکی کو مرتب کرتا ہے یا فکر کا دھارا جس سمت کی طرف گامزن ہوتا ہے، اعمال و افعال بھی اسی راستے کا انتخاب کرتے ہیں،اس حوالے سے مخصوص تہذیبی ارتقا بھی ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔لہذا بھادی سماج سے تعلق رکھنے والی دیب لینا کو بہتر سماج کی تشکیل میں بے خوف وخطر آگے بڑھتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔خواب کے متعلق ایک بیان:

> ''اور علامتوں کی یہ خصوصیات ہوتی ہیں کہ اس کی توضیح ہر کوئی اپنے اپنے طور پر کرسکتا ہے۔آپ انھیں مذہب سے جوڑ کر دیکھ رہی ہیں، میں انھیں نفسیات سے جوڑ کر دیکھوں گا۔اور سیاسیات کا پروفیسر سیاسی مظاہر سے۔ اب رہی بات خواب کی،تو محترمہ خواب تو ظاہر ہی ہوتے ہیں نشانات اور علامات کی شکل میں۔لہذا خواب کبھی یک جہت نہیں ہوسکتے ،کثیر الجہات ہوتے ہیں۔اسی لیے تو اس کی تعبیر بتانا آسان نہیں ہوتا۔''۳۰۱

ناول میں آزادی کے فلسفے سے استفادہ کرتے ہوئے کرداروں کو متحرک بنا کر پیش کیا گیا ہے اور یہ تشکیل،صورت حال میں جز وقتی نہیں بلکہ جا بجا بین السطور میں اس کے عملی محرکات کو بھی دکھایا گیا ہے۔ناول میں آزادی کا عمل مختلف جہتوں سے کارفرما نظر آتا ہے جس میں ،مذہب، غربت،دوستی،انسانی سوچ وغیرہ شامل ہیں۔ناول کا ایک کردار تقریر کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''سب سے اہم چیز ہے ،آزادی۔بھوک سے آزادی،غریبی سے آزادی،مذہب کے نام پر کیے جانے والے استحصال سے آزادی۔دوستو، یہ آزادی ضروری ہے۔لیکن سب سے بڑی آزادی ہے سوچ کی آزادی۔ پرانی سوچ سے ،روایتی سوچ سے،یہ ہمیں محکوم بناتی ہے۔ جاگیردارانہ نظام کی پیداوار ہے یہ۔غلامانہ ذہن یہیں سے پنپتے ہیں۔یہ ہمیں پیچھے کی اور دھکیلتی ہے۔۔۔''ص۶۸

موضوعات کے حوالے سے غور کیا جائے تو درج بالا اقتباس میں،صورت حال اور کرداروں کی سوچ کی کلید واضح نظر آتی ہے۔آزادی کے پیش نظر دیب لینا کا بھادی سماج کی ترقی کے لیے کام کرنا ،مذہبی بندشوں سے آزاد،ارباز کی محبت میں گرفتار ہوجانا،شادی بیاہ جیسی رسم سے خود کو آزاد رکھنا اور بلا جھجک ارباز سے جنسی تعلقات قائم کرنا۔تاہم یہاں ایک سوال قائم

سب کے باوجود کیا وہ خوش تھی ؟ ۔ آزادی کی خواہش میں جہاں ایک طرف خارجی سطح پر، دیب لینا کے کردار کے تعمیری پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے وہیں دوسری طرف ،اس آزاد خیالی کے نتیجے میں، اس کی داخلی تخریب کاری بھی سامنے آتی ہے اور نفسیاتی طور پر وہ کرب کا شکار نظر آتی ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو کوئی بھی نظریہ یا فلسفہ کبھی یک جہت نہیں ہوتا ہے بلکہ نظریات یا فلسفے کثیر الجہت عناصر کو جنم دیتے ہیں جس کے ہر عنصر میں ''اگر''If،''تو''Then اور''لیکن''But کی گنجائش ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔اس لیے کوئی بھی فلسفہ یا نظریہ بظاہر ٹھوس بنیادوں پر قائم ہونے کے باوجود سیال ہوتا ہے جو عملی زندگی کے تقاضوں کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ دیب لینا کے لیے آزادی کا یہی انتخاب اس کی تنہائی کا سبب بنتا ہے،خیالات کی افراط و تفریط کے باعث ،وہ ارباز کے متعلق وہم میں مبتلا رہنے لگتی ہے اور اس تنہائی کا فائدہ اٹھا کر سیاسی غنڈے اسے گولیوں سے بھون دیتے ہیں گویا یہی عوامل اس کی موت کا سبب بنتے ہیں۔ دیب لینا کے کردار اور شخصیت کی صفات کے بیان میں براہ راست اور بالواسطہ دونوں طرز سے استفادہ کیا گیا ہے جس میں راوی نے اس کی جسمانی توضیحات، تو کہیں کردار کے مکالمے سے اس کے شخصی اوصاف کا بیان کیا ہے اور اس پیرایہ اظہار سے راوی کا مقصد اضافی معلومات بیان کرنا نہیں بلکہ ناول کی مجموعی صورت حال پر کردار کے اثر انداز ہونے کی کئی صورتوں اور جہات کو اجاگر کرنا ہے۔اقتباس:

''ہجور آما جوانی میں بہت حسین تھیں ۔دراز قد، گوری رنگت، کالی ریشمی زلفیں، کشادہ پیشانی، پتلے پتلے ہونٹ ،بھرے بھرے گال! ناک زیادہ لمبی نہ تھی ۔آنکھیں بھی بہت بڑی بڑی نہ تھیں۔البتہ مجموعی طور پر چہرہ دلکش تھا۔ایسا دلکش کہ ایک بار نظر ٹک گئی تو آسانی سے ہٹتی نہ تھی۔''ص ۸۲

دوسری جگہ کردار کے ذریعے بیان یوں ملتا ہی:

''یہ سچ ہے کہ ہم دونوں پورے ملک میں گھوم گھوم کر بھادیوں کو اکٹھا کرتے رہے ہیں۔لیکن اس کام میں بھی آپ ہماری مدد کرتی رہیں ۔پیسہ ،رسوخ، مشورہ! جب جس چیز کی ضرورت پڑی آپ نے کبھی ہاتھ پیچھے نہیں کھینچا۔فرینڈ، فلاسفر اور گائیڈ بن کر ہمیں راستہ دکھاتی رہیں۔آپ نہ ہوتیں تو شاید آج بھی ہم اس دلدل میں پڑے ہوتے۔''ص ۸۳

ایک اور اقتباس:

''دیب لینا کو باپ کی مقبولیت کا فائدہ ملا۔اور پھر سر پر کامریڈ سرینگ چھتری جیسے منجھے ہوئے کا ہاتھ تھا۔اپنی باتیں رکھنے کا سلیقہ بھی اسے خوب آتا تھا۔نڈر تھی، سچی تھی اور سماجی خدمات کا جذبہ بھی کم نہ تھا۔''ص ۲۵۱

دراصل یہ تمام اقتباسات اپنی نوعیت کے اعتبار سے کردار کے بیان میں التباس پیدا کرتے ہیں اور ناول کے ایک بڑے حصے کی قرأت کے بعد بھی قاری پر یہ واضح نہیں ہو پاتا کہ ہجور آما، دیب لینا اور دیبی ایک ہی کردار ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے؟۔یہاں راوی نے قصداً بیان میں، اشتباہ illusion پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طریقہ کار نے ناول کو مزید پر تجسس اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ناول میں دیبی / دیب لینا/ ہجور آما کو ثنویتی تخالف کے تقسیمی رویوں، نیز طاقت کی تقسیم اور اقتدار میں جدلیاتی نظام فکر کو مدنظر رکھتے ہوئے ،مثبت سوچ کی حامل کردار کے طور پر متحرک اور پُرعزم دکھایا گیا ہے۔جس میں ماضی اور حال کی افقی اور عمودی سطح پر بیانیہ تشکیل پذیر ہو کر کردار کو تہہ در تہہ واضح کرتا جاتا ہے۔ ناول کی زمانی ساخت میں سہ زاویائی نظریہ کارفرما ہے اور راوی نے اس طرز کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔اس کو حال، ماضی بعید اور درمیانی ارتقائی دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، جس میں علت و معلول کی تقلیب جا بہ جا موجود ہے۔دیب لینا کے کردار کو ڈرامائی انداز سے بھادی سماج کے حقوق کے لیے تگ و دو کرتے ،اور بصر کی ماں کے روپ میں خود کو پیش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔تاہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا کہ کسی قوم کی ترقی اور اس کو دلدل سے نکالنے کے لیے خواہ کتنے ہی فلاحی کام کیوں نہ کیے جائیں ،اس کے باوجود کچھ افراد اپنی گذشتہ صورت حال کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ اس نکتے کو پیش کر کے راوی نے ،مثالیت پسندی سے دامن بچاتے ہوئے، قصے کا حقیقی رخ دکھانے کی اچھی اور کامیاب کوشش کی ہے جس سے صورت حال کے تناظر میں حقائق پر غور کرنے کے مزید امکانات سامنے آسکتے ہیں۔اقتباس:

''نہیں رے پھلوا، اس لڑکے نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔تلسی گڑھ کی عورتیں اب بھی پیشہ کرتی ہیں۔یہ بات تو مجھے معلوم ہی نہیں تھی''۔ہجور آما نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''کرتی ہوں گی اکّا دکّا، اس سے آپ کی محنت اکارت تھوڑے ہی ہوئی ۔ایسی عورتیں تو شریفوں کی بستی میں بھی رہتی ہیں ۔اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟''ص ۴۳۱

پلاٹ کے تشکیلی سفر میں زبان کو جس سلیقے سے بیان میں برتا گیا ہے اس سے کرداروں کی افتادِ طبع اور ردِ اعمال ناول کی فضا کو بخوبی متاثر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔غرض یہ کہ ہجور آما کو اردو ناول کی تاریخ میں موضوع اور تکنیک دونوں اعتبار سے اہم ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

جدید اردو غزل کی آبرو: حسرتؔ موہانی

ڈاکٹر شبانہ نکہت انصاری
(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بھگت سنگھ گورنمنٹ پی۔جی۔کالج، جاورہ، ضلع رتلام (ایم۔پی)

اُردو شاعری کی اپنی ایک روشن اور تاب ناک تاریخ ہے۔اس تاریخ کو تابانی عطا کرنے میں دیگر اصناف کی بہ نسبت غزل کا سب سے اہم اور نمایاں کردار رہا ہے۔غزل نے مختلف ادوار طے کرنے کے بعد اُردو شاعری کو نہ صرف عالمی ادب میں شامل کروایا بلکہ اپنی مستحکم شناخت قائم کرلی ہے۔آج کی ترقی یافتہ دنیا اور گلوبل ولیج میں غزل ہر رنگ، موضوع، مزاج اور ماحول کو اپنے رنگ میں شامل کر کے روز افزوں ترقی کے مدارج طے کر رہی ہے۔گذشتہ نصف صدی کے نشیب و فراز کے باوجود غزل کے متعلق رشید احمد صدیقی کے قول کی اہمیت آج بھی برقرار ہے کہ'' غزل اردو شاعری کی آبرو ہے''

غزل کو اُردو شاعری میں بلندی عطا کرنے میں ولیؔ، میرؔ، غالبؔ وغیرہ نے بڑی خدمات انجام دی ہیں۔آل احمد سرور نے مذکورہ شعراء کو'' دیو زادوں'' اور مومنؔ و آتشؔ وغیرہ کو'' مینا کاروں'' سے معنون کیا ہے۔ایسے ہی دیوزادوں اور مینا کاروں میں ہر دو معنی میں مجاہد آزادی مولانا حسرتؔ موہانی کا بھی بلاشبہ شمار کیا جاسکتا ہے۔

حسرتؔ نے جن ناموافق اور نازک حالات میں اردو غزل کو سنبھال کر رکھا، وہ لائق ذکر کارنامہ ہے۔موصوف کے اس فن کارانہ سہارے سے کسی طور چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔غزل میں دہلی اور لکھنؤ دبستانوں کی رنگا رنگی، حق گوئی، صداقت پسندی، چلتے پھرتے محبوب سے غزل کی روشناسی، وغیرہ جیسی اُن کی زبردست خدمات کے تحت کہنا مناسب ہوگا کہ وہ اردو غزل کے نئے دور کے محافظ ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حسرتؔ اردو غزل کے نئے دور کے محافظ کیوں ہیں؟ اس نقطے کو سمجھنے کے لئے اس دور کے شعری و ادبی رجحانات کے ساتھ سیاسی و سماجی محرکات سے روبرو ہونے کی ضرورت ہے۔بات خاصی طولانی ہے لیکن اس سلسلے میں چند معروضات سے اس دور کے تاریخی پس منظر کو کسی حد تک سمجھا جاسکتا ہے۔مثلاً غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہا گیا، بے وقت کی راگنی بتایا گیا، معشوق کی موہوم کمر سے تشبیہ دی گئی، یہاں تک کہ اس کی گردن مار دینے کا فتویٰ بھی جاری کیا گیا۔ڈگر سے بعید تنقید نے غزل کو ٹھکانے لگانے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ایسے غزل پراگندہ ماحول میں حسرتؔ کی غزل سے والہانہ وابستگی نے ماحول کو مہکایا، جوش دلایا، وہ تمام انتظام کئے، جس سے غزل آبروئے شاعری کے مقام پر مستحکم رہی۔حسرتؔ کی یہ کوشش لائق تحسین اور تاریخ ادب میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

حسرتؔ کی شاعری اور خصوصاً غزل کے کئی پہلو ہیں۔لیکن اہم بات یہ ہے کہ اُن کی غزل کا مرکز'' محبت'' ہے۔اسی مرکز سے وہ ہر سمت اور ہر محاذ پر نظر رکھتے ہیں۔اُن کی نظر میں عشق لافانی ہے۔حسن اُن کے یہاں رنگا رنگ اور وسیع مفہوم لئے ہوئے ہے۔اس لئے عشقیہ شاعری اُن کی نمائندہ شاعری ہے۔مثلاً

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
کیوں نہ ہو تیری محبت سے منور جان و دل — شمع جب روشن ہوئی گھر میں اُجالا کردیا

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

'حسرتؔ محبت کے خوشگوار، ماحول کے بہترین، مقبول ترین اور مہذب ترین مصور اور ترجمان تھے''

حسرتؔ نے فطرت سے بڑا حساس دل اور حساس طبیعت پائی تھی۔اس پر صبر وضبط، استقلال کی چادر نے شخصیت کو باکمال کر دیا۔اکثر لوگ غیر سکونی حالات میں صبر وضبط توڑ دیتے ہیں،لیکن حسرتؔ ایسے گہرے کنویں کے مانند تھے کہ جو دھوپ لیتا ہے اور ٹھنڈا پانی دیتا ہے۔گرم حالات میں بھی اُن کی زبان کھلی تو اُس میں تازگی اور خنکی تھی۔اس لئے قید وبند میں بھی اُن کی زبان سے اس قبیل کے اشعار نمودار ہوتے ہیں:

ہجر میں پاس میرے اور تو کیا رکھا
اک تیرے درد کو پہلو میں چھپا رکھا

قید و بند کی صعوبتوں میں اس قسم کے اشعار واقعی اُن کی منضبط طبیعت کو واضح کرتے ہیں :

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

جیل کے مشاہدات، عدالت سے جرمانہ، پریس کا چھن جانا اور معاشی تنگ دستی کے دور میں حسرتؔ کے علاوہ اور کسی شخص کے بس کی بات نہ تھی کہ غیر سکونی حالات کو پُرسکون ماحول میں بدل کر مطمئن رہے اور معبود ومشکور کی شکر گزاری کرتا رہے۔ظلم و استبداد کے گھنگھور بادلوں کو عشق ومحبت سے پاٹ کر انہوں نے منزلوں کی طرف جواں ہمتی سے سفر جاری رکھا ۔واقعی یہ اُن کے حلیم الطبع ،وسیع القلب اور ثابت قدم رہنے کی عمدہ مثال ہے۔درج ذیل سر کہیں ، بال کہیں ، ہاتھ کہیں ،پاؤں شعر نہ صرف مذکورہ خوبیوں کا غماز ہے بلکہ اردو ان کا سونا بھی کس شان کا سونا کی شعری روایت میں انہیں کا حصہ ہے:

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود سونا،جاگنا،اٹھنا ،بیٹھنا ،چلنا، پھرنا ،دانتوں رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام میں انگلی دبانا،کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا وغیرہ

حسن ،عشق اور جذبات کی حقیقی مصوری نے اُن کی غزلوں کو دوآتشہ کر دیا ہے ۔

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لئے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

کھینچ لینا وہ میرا پردے کا کونا دفعتاً
وہ ترا گھبرا کے انگلی دانتوں سے کاٹنا یاد ہے

حسرتؔ صرف حسن وعشق کی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ عشق کے فلسفے سے بھی واقف ہیں ۔دنیا کی ابتداء اور انتہا عشق پر مبنی ہے۔عشق کا محور حسن ہے۔حسرتؔ نے ہر شئے میں حسن کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے ۔اُن کے یہاں عشق مجروح نہیں ہوتا۔حسن کی رسوائی بھی اُنہیں منظور نہیں :

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

ہے اس طرح بھی کہ

ہے حسرتؔ بہت بلند ہے مرتبۂ عشق
تجھ کو تو مفت لوگوں نے بدنام کر دیا

بقول آل احمد سرورؔ:

'' عشق ہی ان کی عبادت ہے
عشق کی راحت اور فراغت کا یہ
تصور ان کا اپنا ہے ''

حسرتؔ کی غزلیں حقیقت پر مبنی ہیں۔حقیقت کی ایسی ترجمانی میرؔ کے بعد حسرتؔ کے یہاں ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ان کا محبوب بالکل عام آدمی ہے۔مثالی یا آئیڈیل نہیں ۔نہ کوئی حور ہے نہ پری بلکہ اسی جیتی جاگتی دنیا کا چلتا پھرتا انسان ہے۔حسرتؔ کی شاعری میں نشاط النساء بیگم (شریک حیات) کی محبت مہکتی ہے۔وہ نہ صرف اُن کی شریک حیات بلکہ شریک شاعری بھی تھیں۔

حسرتؔ نے شاعری میں محبوب کی ہر ادا: سبھی کچھ بڑی عمدگی سے بیان کر دیا ہے:

کھینچ لینا وہ میرا پردے کا کونا دفعتاً
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

حسرتؔ قدیم مے خانوں سے سیراب ہوکر نئے نئے مے خانوں کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔انہوں نے میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ، نسیمؔ، تسلیمؔ وغیرہ سبھی اساتذہ سے فیض اٹھایا۔اس بات کی تصدیق بھی اپنے اشعار سے کر دی ہے:

غالبؔ و مصحفیؔ و میرؔ و نسیمؔ و مومنؔ
طبع حسرتؔ نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

طرز مومنؔ میں مرحبا حسرتؔ
تیری رنگیں نگاریاں نہ گئیں

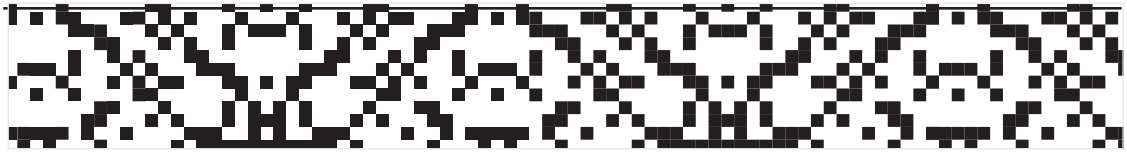
حسرتؔ نے جدید اردو غزل کو معنویت عطا کی۔غزل کو حقیقت و فطرت کا آئینہ بنایا۔یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے انہیں قدیم و جدید کا سنگم قرار دیا ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:

'' حسرتؔ کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انہوں نے غزل کے قدیم وجدید رنگ کو باہم اس طرح ملا دیا کہ ان کی غزل سے ہر رنگ اور ہر ذوق کا قاری متاثر ہوتا ہے ''

فراقؔ گورکھپوری نے لکھا ہے کہ:

'' حسرتؔ کے اشعار بیان حسن وعشق میں صاف مصحفیؔ ۔۔۔جرأت ۔۔۔اور مومنؔ کی یاد دلاتے ہیں۔لیکن حسرتؔ کی شاعری محض مصحفیؔ، جرأت اور مومنؔ کی آواز کی بازگشت کہیں نہیں ہے۔وہ ان تینوں کے انداز بیان و دیکھو جدان اور ان کے فن شاعری کی انتہا وتکمیل ہے ''غرض کہ حسرتؔ کی غزل گوئی کے پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح غزل اردو شاعری کی آبرو ہے ،اسی طرح حسرتؔ جدید اردو غزل کی آبرو ہیں۔

☆☆☆



وفیات برہان

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی وفیاتی تحریروں پر مشتمل ایک قیمتی دستاویز

محمد اویس سنبھلی

(157/178، بارودخانہ، نزد لال مسجد، گولہ گنج، لکھنؤ۔ موبائل: 7905636448)

'وفیات نگاری' ایک اہم صنف ادب ہے، اس کے ابتدائی نقوش 'اسماء الرجال' میں ملتے ہیں۔ ماہرین فن کا خیال ہے کہ اس صنف ادب کو مسلمانوں نے اپنے عہد زریں میں عربی زبان میں فروغ دیا، بعد میں فارسی زبان میں بھی اہل علم نے اس کی صنف ادب کو آگے بڑھایا۔ اس میں مرحوم شخصیات کے جملہ سوانحی، علمی اور سماجی احوال امکانی حد تک ماہ وسال کے التزام کے ساتھ منضبط کیے جاتے ہیں۔ وفیات نگاری میں اردو مجلّات کی خدمات بے حد اہم ہیں۔ اس میں ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ برہان دہلی، ماہنامہ الفقیہ امرتسر اور ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے۔ ان مجلّات میں شائع وفیاتی تحریروں نے اردو کے وفیاتی ادب میں نہ صرف بیش قدر اضافہ کیا ہے بلکہ اس کے ابتدائی نقوش انہیں وفیاتی تحریروں سے اُبھرے ہیں۔ ماہنامہ معارف، ماہنامہ الفقیہ کی وفیاتی تحریریں مختلف ناموں سے کتابی شکل میں شائع ہوچکی ہیں۔ چنانچہ معارف کی وفیاتی تحریریں 'یاد رفتگاں' [علامہ سید سلیمان ندویؒ]، 'بزم رفتگاں'، حصّۂ اوّل ودوم [سید صباح الدین عبدالرحمن]، ماہنامہ الفقیہ کی وفیاتی تحریریں 'وفیات مشاہیر الفقیہ' [محمد افروز قادری چریاکوٹی]، ماہنامہ معارف و ماہنامہ الرشاد کی وفیاتی تحریریں 'کاروان رفتگاں' [مولانا مجیب اللہ ندویؒ]، اور ماہنامہ برہان کی وفیاتی تحریروں کو ڈاکٹر تبسم صابر نے مرتب کرکے شائع کیا ہے، جو اس وقت ہمارے مطالعہ میں ہے۔

ہندوستان میں سرسید کی تعزیتی تحریریں [ڈاکٹر اصغر عباس] شبلی کی تعزیتی تحریریں [ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی]، وفیات ماجدی، معاصرین [مولانا عبد الماجد دریابادی]، پُرانے چراغ [مولانا سید ابوالحسن علی ندوی]، کاروان رفتہ [مولانا اسیر ادروی]، وفیات مشاہیر اردو [محمد بشارت علی خاں فروغ]، وفیات مشاہیر بہار 1947ء سے 1999ء تک [ڈاکٹر سید شاہد اقبال]، وفیات اطبّاء ہند و پاک تین جلدیں، [حکیم وسیم احمد اعظمی] اور اسی طرح پاکستان میں کاروان رفتہ [ڈاکٹر محمد ایوب قادری]، یاد رفتگاں [ماہر القادری]، نقوش رفتگاں [مولانا محمد تقی عثمانی]، وفیات مشاہیر پاکستان، وفیات اعیان پاکستان، وفیات خفتگان خاک لاہور، وفیات خفتگان کراچی [پروفیسر محمد اسلم]، وفیات خفتگان خاک گجرات، وفیات ناموران پاکستان، وفیات اہل قلم، وفیات مشاہیر لاہور، تنہائیاں بولتی ہیں، وفیات نعت گویان پاکستان، وفیات مشاہیر کراچی، وفیات مشاہیر خیبر پختون خوا [ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ]، شہر خموشاں کے مکیں: اسلام آباد، راولپنڈی، لاہور میں مدفون مشاہیر دو جلدیں، شہیدان وطن [ایم آر شاہد] اور وفیات اہل قلم عساکر، وفیات اہل قلم خواتین، وفیات اہل قلم علماء [خالد مصطفی] کے ذریعہ وفیاتی ادب پر بڑا معتبر کام ہوا ہے۔

'وفیات برہان' مرتبہ ڈاکٹر تبسم صابر مولانا سعید احمد اکبرآبادی [8/نومبر 1908ء - 24/مئی 1985ء] اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی [1901ء-12 مئی 1984ء] کی تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایک عظیم علمی شخصیت تھے۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ ندوۃ المصنفین کے ماہنامہ برہان، دہلی جیسے علمی رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ ندوۃ المصنفین کا قیام 1938ء میں عمل میں آیا۔ مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی اس ادارے کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ یہ ایک علمی، تحقیقی اور اشاعتی ادارہ تھا۔ اس ادارہ نے 250/سے زائد کتابیں شائع کیں۔ ماہنامہ 'برہان' ندوۃ المصنفین کا علمی ترجمان تھا، جس کا خاکہ رسالہ 'معارف' اعظم گڑھ کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی 1938ء سے 1985ء تک [1943ء سے 1946ء کے وقفے کے ساتھ] اس علمی مجلہ کے مدیر رہے۔ جس طرح علامہ سید سلیمان ندوی 'شذرات' کے عنوان سے ماہنامہ 'معارف' کا اداریہ لکھتے تھے، اسی طرح 'نظرات' کے عنوان سے ماہنامہ برہان کا اداریہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی لکھا کرتے تھے۔

تصنیف وتالیف سے مولانا اکبرآبادی کا رشتہ بہت مضبوط تھا۔ ماہنامہ برہان کی کم و بیش 44/سالہ ادارت میں انھوں نے اداریوں کے علاوہ 58/علمی وتحقیقی مضامین قلم بند کیے، کئی اہم کتابوں پر تبصرے لکھے۔ اسی کے ساتھ مختلف عناوین سے تقریباً 13/کتابیں منظر عام پر آئیں۔ علاوہ ازیں تذکرہ نگاری کے باب میں مولانا کی وفیاتی تحریریں شامل کی جاسکتی ہیں۔

''وفیات برہان' میں کل 259 شخصیات کا ذکر ہے، جس میں مولانا اکبرآبادی کے قلم سے 248 اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی کی قلم بند کی ہوئی 11/شخصیات کا تذکرہ شامل ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر تبسم صابر نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے مختصر احوال اور علمی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے نیز 'وفیات سعید احمد اکبرآبادی' کے عنوان سے مولانا کی وفیات نگاری کے تعلق سے چند معروضات پیش کیے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم صابر کا تعلق سرزمین رام پور سے ہے۔ یہی ان کا جائے پیدائش ہے۔ ان کی تعلیم کا آغاز جامعۃ الصالحات، رامپور سے ہوا اور یہیں سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے عربی کیا۔ 2009ء میں 'مفتی محمد سعد اللہ مرادآبادی ثم رامپوری کی علوم عربیہ میں خدمات'' کے موضوع پر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ دسمبر 2005ء کے ماہنامہ 'الفرقان' لکھنؤ میں 'امت مسلمہ کا اتحاد واتفاق اللہ کو مطلوب ہے' کے عنوان سے ان کا پہلا مضمون شایع ہوا۔ یہیں سے لکھنے کی ابتدا ہوئی۔ 2005ء سے اب تک تقریباً 30/مضامین ہند و پاک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے کچھ عرصہ بعد رامپور رضا لائبریری میں عربی مخطوطات کی وضاحتی فہرست اور تحقیقی خدمات پر ان کا تقرر ہوا۔ فی الوقت یہی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ 2013ء میں 'ملفوظات صوفیائے ہند: ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ماخذ' کے عنوان سے رامپور رضا لائبریری میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی سمینار میں بڑھے گئے مقالات کی پروسیڈنگس مرتب کی، جو خصوصی شمارہ جرنل نمبر 30/2016 کا حصّہ بنی۔ رضا لائبریری کی مشارکت سے آکاش وانی رامپور میں ہونے والے پروگرام میں لائبریری کے مخطوطات اور مطبوعات سے متعلق ریڈیو پر تقاریر کیں۔ رضا لائبریری میں موجود عربی

مخطوطات کی دوجلدیں انگریزی میں Discriptive Catalogue کے نام سے شائع ہوچکی ہیں۔ 1840ء تا 1855ء کی تاریخ 'نواب محمد سعید خاں کے عہد کی علمی و ادبی سرگرمیاں' کے عنوان سے 2016ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ ہندوستان کے مایہ ناز عالم و مشہور فلسفی مولانا محمد عبدالسلام خاں رامپوری مرحوم کے مقالات دوجلدوں میں مرتب کرکے شائع کیے۔ رسالہ 'برہان' میں شامل مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی کی وفیاتی تحریریں 'وفیات برہان' کے نام سے 2019ء میں شائع ہوئی۔ 'وفیات برہان' مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی کے حوالے سے ایک دستاویزی حیثیت کی حامل کتاب ہے۔

44/سالہ ادارت میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی 'نظرات' کے عنوان سے جو اداریہ تحریر کیے ان میں 248/شخصیات کا نثری مرثیہ بھی شامل ہے۔ جولائی 1938ء میں

ماہنامہ برہان کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تو مولانا نے 'نظرات' کے عنوان سے ڈاکٹر سر محمد اقبال کے انتقال پر لکھا:

''دو سال کی طویل علالت کے بعد اسلام کے مایۂ ناز فرزند ڈاکٹر سر محمد اقبال نے بتاریخ 21 اپریل 1938ء کو لاہور میں انتقال فرمایا اور ہماری بزم علم و حکمت کو خالی چھوڑ کر رہ گزار عالم جاودانی ہوگئے۔ اقبال کا وجود عشقِ رسول کا پیکر تھا۔ اخیر عمر میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ جہاں 'مدینہ' اور 'آقائے مدینہ' کا ذکر آیا اور بے ساختہ رونے لگتے۔ ان کی شاعری علم و حکمت کے انمول موتیوں کا خزانہ اور ان کی زبان حقیقت و معرفت ربانی کی ترجمان تھی۔ ان کا قلب اسلامی سوز و گداز سے معمور اور ان کا دماغ حب اسلام کے نشہ میں مخمور تھا۔۔۔

۔۔۔ندوۃ المصنفین جن اغراض و مقاصد کے ماتحت قائم ہورہا ہے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ان سے خاص دلچسپی تھی اور اپنی گفتگو میں ان کی اہمیت کو بڑے زور سے بیان کرتے تھے، علی الخصوص فقہ کی جدید ترتیب و تدوین کا مسئلہ ان کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔۔۔ندوۃ المصنفین کے ابتدائے قیام سے ہی ہمارا ارادہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنے ادارے کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں شامل کریں اور ہمیں قوی توقع تھی کہ آں مرحوم ہماری اس خواہش کو مسترد نہ کرتے۔ صدحیف! کہ ابھی ہم ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے لاہور کا ارادہ کررہے تھے کہ اچانک ان کی وفات کی اطلاع آگئی اور ہمارا یہ منصوبہ دل کا دل ہی میں رہ گیا۔''

یہ ماہنامہ برہان میں 'نظرات' کے عنوان سے شائع ہونے والی پہلی تحریر تھی۔ اس کے بعد مولانا کے قلم سے سیکڑوں قیمتی تحریریں نکلیں، جو وقت اور حالات کا جائزہ لیتیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی علمی و فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دیا کرتی تھیں نیز انھیں 'نظرات' کا ایک بڑا حصہ وہ بھی ہے جو ملی، سیاسی، علمی و ادبی شخصیات کی وفات پر مولانا نے قلم بند کیا۔ بقول ڈاکٹر تبسم صابر:

''۔۔۔ان 44، 45 سالوں میں انھوں نے تقریباً 248/اشخاص کی موت پر اشک فشانی کی، جو قطرہ قطرہ ہوکر نظرات کے صفحات پر جمع ہوتے گئے اور بالآخر جنھوں نے سمندر کی شکل اختیار کرلی۔ اس سمندر کے موتی متعدد شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات تھیں جن کے ساتھ خصوصی تعلقات، برادرانہ خلوص، بزرگانہ شفقت اور عزیزانہ محبت کی وجہ سے ان کا غم مولانا کا ذاتی غم بن گیا تھا۔ نظرات کے اس

حصے میں مولانا نے جن اشخاص کی ماتم سرائی کی ہے ان میں سے بعض آپ کے اساتذہ ہیں تو بعض قریبی عزیز، کوئی اپنی علمیت کی وجہ سے مولانا کے دل میں خصوصی مقام رکھتا ہے تو کسی کے افکار وخیالات مولانا کو اپنے ذہن سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ غرض ہندو، مسلم، عیسائی، یہودی، ہندوستانی، انگریزی، مصری، ترکی، جج، بیرسٹر، عالم، شاعر، سیاست داں، غیر سیاست داں، شیخ طریقت، مصلحین ومجاہدین سبھی کا ماتم اس میں شامل ہے۔''

نومبر 1984ء کے شمارے میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے 'نظرات' کے عنوان سے آخری وفیاتی تحریر اندرا گاندھی کے دردناک حادثۂ قتل پر لکھی تھی۔ جولائی 1938ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اندرا گاندھی کے دردناک حادثہ پر تمام ہوا۔ اس حادثہ سے پورے ملک میں غم کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مولانا نے اس حادثہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا:

''۔۔۔ایک نفسیاتی اصول ہے کہ جب مذہبی جذبات بھڑکتے ہیں تو انسان دیوانہ ہوجاتا ہے اور اس وقت وہ یہ نہیں سوچتا کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں خود اس کی کم نظری یا غفلت کو دخل ہے یا نہیں۔ اس کے عتاب اور غضب کا نشانہ صرف وہ شخص یا جماعت ہوتی ہے جس نے اس کے مذہبی کو بھڑکایا ہے، چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں اندیشہ پہلے سے تھا اور ملک اندرا گاندھی جیسی محبوب اور ہر دل عزیز شخصیت سے محروم ہوگیا''۔

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی وفیاتی تحریریں ایک خاص عہد کی تاریخ کی کچھ جھلک ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ ان تحریروں میں اکثر شخصیات کا ذکر قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے نیز اس کا بھی اہتمام مولانا کی ان تحریروں میں دیکھنے کو ملا کہ اکثر مرحومین کے تذکرے میں، تاریخ پیدائش، وطن، تاریخ وفات اور مدفن کا ذکر کیا ہے۔ اس اعتبار سے بھی مولانا کی تحریریں بہت اہم ہیں۔ کتاب میں شامل شخصیات کا بڑا حصہ اُن اصحاب پر مشتمل ہے، جس کا کسی نا کسی طور پر دارالعلوم دیوبند سے تعلق رہا ہے۔ کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل تمام وفیاتی تحریروں کے آخر میں مکمل حوالہ نقل کیا گیا ہے۔

☆☆☆

اعلان

سہ ماہی ادبی نشیمن لکھنؤ کا اگلا شمارہ **رباعی نمبر** پر مشتمل ہوگا۔ قلمکاروں سے گزارش ہے کہ رباعیات سے متعلق اپنی تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی تحریریں درج ذیل ای میل آئی ڈی پر جلد سے جلد ارسال فرمائیں تاکہ رسالہ بروقت منظر عام پر آسکے۔

امید ہے یہ خصوصی نمبر بھی ادبی نشیمن کی گزشتہ خصوصی اشاعتوں کی طرح قبول عام حاصل کرے گا۔ اس لیے مشتہرین اور تاجران کتب اپنے اپنے آرڈر فی الفور بک کرالیں پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

شکریہ

ادارہ ادبی نشیمن

Mob: 9415693119
www.adbeenasheman.com
E-mail: adbeenasheman@gmail.com

Mob: 8707260591, 9415693119

بہار میں جدید اردو غزل: سمت و رفتار

ڈاکٹر محمد شرف عالم

(للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ 846004 (بہار)

اردو جن علاقوں میں پھلی پھولی اور پروان چڑھی ان میں بہار خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور یہاں اردو کا چراغ پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ زمانہ قدیم سے اردو کا یہاں چرچہ ہے کیونکہ زمانہ قدیم سے یہ عالموں اور شاعروں کا مسکن رہا ہے۔ لیکن اٹھارویں صدی میں ہی یعنی اٹھارویں صدی کے وسط میں ہی اسے باقاعدہ دبستان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

جغرافیائی اعتبار سے لکھنؤ کے نزدیک تر ہونے کے باوجود اس دبستان کی خصوصیات دبستان دہلی سے زیادہ ملتی ہے۔ اس مماثلت کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر اختر اورینوی نے فرمایا ہے کہ اس کا سبب دہلی کی پیروی نہیں بلکہ یہ ہے کہ دہلی عظیم آباد کے حالات اور ادبی ماحول میں بڑی حد تک یکسانیت تھی۔

اردو کی تاریخ میں حضرت امیر خسرو کی طرح بہار میں حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری ثم بہاری کی ذات مبارک ہے۔ یہاں منیر شریف کی درگاہ میں حضرت شرف الدین منیری کا ایک نسخہ موجود ہے یہ ۹۱۱ھ یعنی ۱۵۱۵ء کا ہے۔ اس تصنیف کے بارے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ یہ ہماری زبان کی قدیم ترین تحریر بھی ہوسکتی ہے۔ زمانہ قدیم کی ایک تصنیف ''سیدھا راستہ'' ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۸۰۱ھ یعنی ۱۷۶۰ء قرار دیا گیا ہے۔ یہ کتاب بہار سے شائع ہوچکی ہے۔

بہار میں شاعری کی باضابطہ روایت بیدلؔ عظیم آبادی سے قائم ہوئی۔ بیدل کا زمانہ ۱۰۵۴ھ سے ۱۱۳۴ھ یعنی ۱۶۴۲ء سے ۱۷۳۱ء کا ہے۔ اردو نظم کی طرح اردو غزل کو بھی یہاں خاصا فروغ حاصل ہوا۔ جوشش عقید دردمند اور راسخ عظیم آبادی شاعری کے چار اہم ستون ہیں۔ جوشش کا کلام قاضی عبدالودود نے مرتب کر کے شائع کر دیا جس سے ان کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ راسخ کے شاعرانہ عظمت سے بھی اہل نظر واقف ہیں۔ بعض ایسے شاعروں کے نام بھی دستیاب ہیں جو محمد شاہ سے پہلے طبع آزمائی کر رہے تھے ان میں عماد اور بی بی دلیہ کے نام مشہور ہیں۔ محمد شاہ بادشاہ کے دور کا ایک شاعر ملا محمد علیم تحقیق عظیم آبادی گذرا ہے جس نے کافی شہرت پائی۔ مرزا موسومی خاں، معز و فطرت کے تلامذہ میں ان کا شمار ہے۔

شادؔ عظیم آبادی کو دبستان عظیم آباد کی آبرو کہنا بجا ہے۔ ان کا کلام اردو شاعری میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ شاد ایک صوفی مشرب شاعر تھے۔ اردو غزل گوئی میں شاد کا درجہ بہت بلند ہے۔ لطف یہ کہ روزمرہ کے عام و فہم الفاظ میں سخت سے سخت مضامین کامیابی کے ساتھ نظم کر لیتے ہیں۔ جس کے وجہ سے جدید غزل گو شعراء میں کے صف میں اول شمار کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک شعر میں دبستان عظیم آباد کی خصوصیت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

نمک ہے فارسی کا درد ہندی شاعری کا ہے　　یہ اردوئے معلیٰ نکتہ سخان عجم دیکھیں

مرزا جان جاناں مظہر کے شاگرد میر محمد باقر وحزیں بھی ایک خوش گو شاعر تھے جو احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں دہلی سے یورپ گئے اور وہاں شعر و سخن کی شمع روشن کی۔ شورش جنہوں نے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا انہیں کے شاگرد تھے۔ مرزا جان جاناں کے ایک اور شاگرد فقیہ صاحب دردمند بھی

کچھ عرصے عظیم آباد میں رہے۔ ان سے ایک ساقی نامہ یادگار ہے۔ اسے بھی اردو شاعری کے اہم نمونوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عظیم آباد بہار کا اہم مرکز رہا ہے اور اردو شاعری کے قدیم دبستانوں میں اسے ہمیشہ بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اردو شاعری کی نشو ونما میں بہار نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ میں غزل کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے اس صنف شاعری پہ نہ صرف ہزاروں مضامین و مقالے لکھے گئے بلکہ بڑی تعداد میں کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی یہ موضوع اتنا زرخیز ہے کہ اس پر کام کرنے کے لئے نہ صرف زمین دستیاب ہے بلکہ آسمان بھی اپنی وسعت کا احساس کراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا رہا ہے۔ شاعری کو جتنا ناز غزل پہ ہے کسی اور صنف پر نہیں ہے شاید ہی کوئی ایسا شاعر گذرا ہو جس نے غزل پر طبع آزمائی نہ کی ہو۔

عہد ولی اور میرؔ و غالب سے لے کر آج تک غزل کی رفتار کبھی دھیمی نہ ہوئی اور نت نئی ترقی کے سمت اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اسی لئے اس فن کو شاعری کی آبرو کے خطاب سے نوازا گیا۔ بہار میں بہت سے غزل گو شعراء ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ ان کے تعلق سے غزل کو ایک نئی سمت و رفتار عطا ہوئی اور ان ہی کے تعلق سے مابعد جدیدیت کی گفتگو جاری ہے اور ان کی غزلوں میں مابعد جدیدیت کی پہچان قائم ہے اس قسم کے شعراء کی صف میں عالم خورشید، خورشید اکبر اور میکش کنول وغیرہ کا نام دیکھا جا سکتا ہے۔

اقبالؔ جیسے عظیم شاعر پر بھی اکثر یہ الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ ان کی زبان کھردری ہے لیکن وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی ساخت شکنی دراصل نئی راہ کی تلاش کا عمل تھا۔ نئی نسل کے شعراء میں آزادی کی آواز اٹھانے والوں میں جمال اویسی کافی سرگرم نظر آتے ہیں۔ ان کے کچھ مضمون شائع ہوئے ہیں جن میں یہ احساس ملتا ہے کہ جدیدیت سے وہ بہت آگے نکل چکے ہیں اور اپنے کلام کو اس طرح پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اس پر کسی قسم کا لیبل نہ لگے۔ لیکن ان کا ذہنی رویہ مابعد جدید شعری رویے سے زیادہ قریب تر ہے اور ان کے کلام میں وہ خصوصیات ہیں جنہیں ہم مابعد جدیدیت کی صورت حال سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کا کچھ شعر دیکھئے:

کتنے تارے آسماں سے گم ہوئے
میں کہاں دنیا سے پوشیدہ ہوا
نیند سے سرشار ہے حیات اویسیؔ
عالم نو خواب ناک دیکھ رہا ہوں

۱۹۸۰ء کے آس پاس ایک نیا رجحان سامنے آیا جسے ہم بہار میں اردو غزل کو نئی سمت و رفتار کو اور تیز تر کر دیا جسے ہم مابعد جدید یا جدید تر کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رجحان تھا جس کے سبب غزل کی دنیا میں خوشگوار تبدیلیوں کا ایک نیا باب روشن ہوا۔ جدیدیت اب تک جس شخصی اور انفرادی جذبے کو اردو میں پیش کرتی آ رہی تھی اب اجتماعی مزاج سے ہم آہنگ کر کے پیش کرنے کا رجحان سامنے آیا۔ اس رجحان سے منسلک شاعروں نے زمین سے اپنا راستہ استوار کیا۔ ان شاعروں کے کہنے کا ڈھنگ اپنے پیشروؤں سے مختلف ہے۔ وہ اپنی باتوں کو سیدھے سادے رنگ میں ادا کرتے ہیں۔ جو وہ کہتے ہیں مستعار نہیں لیتے بلکہ ان کی اپنی بات ہوتی ہے۔ نئی نسل کے شعراء جو لفظیات وضع کرتے ہیں ان کا اپنا منطقی جواز ہے۔ مجھے اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے۔ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ راشد طراز پچھلی روایتوں سے وابستہ ہیں لیکن جو نیا شاعرانہ ماحول بنا ہے اس کے بھی ایک رکن خاص ہیں۔ ہر چند اس کی غزلوں میں کوئی توڑ پھوڑ اور تخریب کا عمل نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی سادگی ہے جو کلاسیکی تہذیب کا اشارہ بنتی ہے حالانکہ سادگی کوئی ایسا وصف نہیں ہے جسے کسی عہد سے جوڑا جائے لیکن عمومی طور پر کلاسیکی تہذیب میں سادگی اس برجستہ بیان کی بھی وکالت کرتی ہے۔ نئی زندگی میں نئے زمانے کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ نعمانی شوق بھی نئے شاعروں میں ایک ہیں اور جو شعراء نئے ممکنات سے آشنا ہوئے ان میں اہم ہیں۔ ویسے ان کے عمومی تیور غم سے عبارت ہے۔ غمگین اشعار میرؔ سے ہوتے ہوئے ناصر کاظمی تک کا سفر طے کر چکے ہیں۔ میرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ نعمان شوق کا غم وجودیت سے عبارت نہیں بلکہ نئے حالات سے پیدا ہونے والے مسائل اور ان کے نتیجے میں تخلیق کار کا متاثر ہونا ایک غمگین فضا مہیا کر رہا

ہے۔اشعار دیکھئے:

خواہ دیوالی ہو تیرے شہر میں یا شب بارات
حق پرستوں کے لئے تو ہے شب عاشورہ سب

☆☆

بڑوں کے گھروں میں رہی ہے بہت زمانے سے
خوشی کا جی نہیں لگتا غریب خانے میں

بہرحال زمانے کی گردنے شاعر کو مضمحل کر رکھا ہے۔یہ اضمحلال کسی ازم کے تحت نہیں بلکہ حق پرستوں کے ساتھ جو رویہ ہوتا ہے اس رویے کا ثمر ہے۔

آج کی تھیوری یہ بتاتی ہے کہ سنگین حالات کو صبر و شکر کے ساتھ گزار دینا چاہئے نہ کہ آہ و بکا میں وقت برباد کرنا چاہئے۔اس دور کے نئے شعراء نے اس بات پر خاص دھیان دے رکھا ہے کہ غزل جو تیور بدل رہی ہے نہ صرف اس سے آشنا ہیں بلکہ اسے برتنے پر بھی قادر ہیں۔ نئے شاعروں میں عین تابش بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے تین شعری مجموعے ''رات کے آخر ہوتے ہوتے''، ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' اور ''اس خوشبو کا یہ قصہ ہے'' شائع ہو چکے ہیں۔ یہ نئے شعراء کی صف میں اپنی جگہ بنانے میں کافی سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ان کا ایک شعر دیکھئے:

اسی قدر ہے حیات و اجل کے بیچ کا فرق
یہ ایک دھوپ کا دریا وہ اک کنارۂ شام
(عین تابش)

محسن رضا رضوی کا شمار بھی نئے شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کا شعری مجموعہ ''فن ہمارا'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔اس مجموعے کے فلیپ پر مظہر امام کی یہ رائے درج ہے جو کی قابل ذکر ہے اور محسن رضا رضوی کے مزاج کو اچھی طرح سے سمجھنے میں معاون ہے:

''شاعری اپنے منصب سے گر جاتی اگر اسے شہرت اندوزی کا وسیلہ بنایا جائے یا اسے جاہ و حشمت کے حصول کے لئے نردبان کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ ایک ایسا آبگینہ ہے جو مادی طمع کی ہلکی سی ٹھیس کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔ مجھے ذاتی طور پر یہ علم ہے کہ محسن رضا رضوی اس آبگینے کی تقدس اور حرمت کی حفاظت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج کے دور میں شعر گوئی کار زیاں ہے وہ اسے حرز جاں بنائے ہوئے ہیں ۔ کیونکہ یہ کاروبار شوق ان کی باطنی آسودگی کا ذریعہ ہے۔ وہ عمر کی جس منزل میں ہیں وہاں سارا سودا اس چہرے کے نام کرنا ہی سرخروئی ہے۔لہٰذا جہاں جہاں وہ اپنی شاعری میں فکر فلسفہ کی لے تیز کرتے ہیں وہاں وہاں وہ اپنے مزاج کے فطری آہنگ کو مجروح کرتے نظر آتے ہیں۔ممکن ہے ابھی ان کے شعر میں ثمر نورستہ کا کسیلا پن بھی ملے لیکن اس کا بھی ایک ذائقہ ہوتا ہے۔''

مثال کے طور پر ان کے دو اشعار دیکھئے:

حصار دیدۂ ساقی میں آ گیا کعبہ
طواف جام جو زندان باوضو نے کیا

☆☆

وہ رضویؔ ڈوب گئے آفتاب کی صورت
حدود میں کبھی جن کی نہ ڈوبا تھا سورج

اس کے بعد نئے دور کے نئے شعراء میں خالد عبادی کا نام آتا ہے جس کی شاعری خصوصاً مختلف معیاری ادبی رسالوں میں شائع ہو رہی ہے۔ وہ ذاتی شناس کے تلاش میں سرگرداں ہیں۔انہیں احساس ہے کہ وہی شاعری قابل اعتنا ہوتی ہے جہاں اس میں روایت کا پاس تو ہو لیکن انفرادیت اور انحراف کی کچھ شکلیں نمایاں ہوئی ہوں۔ اسی طرح طارق متین بھی نئے شاعر ہیں اور ان کی پیدائش ۱۹۷۰ء میں ہوئی لیکن ان کا مزاج نئے شاعروں سے مماثل ہے۔بنیادی طور پر یہ غزل کے شاعر ہیں۔طارق متین غزل کہتے ہیں اور اپنی بساط تک خوب کہتے ہیں۔بطور نمونہ ان کا ایک شعر دیکھئے:

ہماری حوصلہ مندی کو طارقؔ
میان و خیر و شر دیکھا تو جائے

اس کے بعد راشد انور راشدؔ بھی نئے شاعر ہیں اور ان کی پیدائش ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ ظاہر ہے ان کی عمر ۵۲ سال لوگ بھگ ہوگی۔ یہ ایک نئے نقاد ہیں اور شاعر تو ہیں ہی۔ان کے بارے میں پہلے ہی کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۸۰ء کے بعد انہوں نے اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی۔مثلاً ان کی غزل کا مطلع دیکھئے:

نظر سے دور ہے مجھ کو آزمایئے بھی
اگر وہ وقت نہیں ہے تو لوٹ آیئے بھی
(راشد انور راشدؔ)

جس طرح کے Abstraction کی بات میں نے کہی ہے وہ سب شعروں میں نمایاں خوبی

طرح موجود ہے۔ یہاں میں ایک ایسے شاعر کا تذکرہ کررہا ہوں جنہوں نے بیک وقت کئی دور دیکھے ہیں ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جدید تر میلانات سے زیادہ ہم رشتہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بزرگوں نے جو تہذیبی اثاثہ گھر پہ رکھا ہے
لگایا ہے اسے آنکھوں سے میں نے سر پہ رکھا ہے
مجھے احساس تنہائی نہیں مانا کہ تنہا ہوں
جو خط لکھا ہے تم نے وہ مرے بستر پہ رکھا ہے
(فریدیؔ)

پہلے ہی شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ فریدی صاحب کو تہذیبی اثاثہ کتنا عزیز ہے اور وہ اثاثے کی کتنی فکر رکھتے ہیں۔

دوسرا شعر واقعی نئے احساسات کا حامل ہے۔ یہاں تنہائی کو ختم کرنے والی چیز کیا ہے۔محبوب کا ایک خط ہے جو بستر پہ رکھا ہے۔ ظاہر ہے یہ خط خود کفیل ہے کافی ہے کہ اگر وہ بستر پر ہے تو کسی قسم کے احساس تنہائی کا گزر نہیں ۔ اس میں رجائی انداز بھی ہے اور احساس تنہائی شکستہ بھی نہیں کرتا ۔ یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں لفظوں کی تہذیب سے کتنی آشنائی ہے اور وہ اپنے محدود دائرے میں رہتے ہوئے اپنے کلام کو مؤثر طریقے سے پیش کرسکتے ہیں۔

عطا عابدی بھی ۱۹۸۰ء کے بعد ابھرنے والے شاعروں میں سے ایک ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۶۱ء میں پیدا ہوئے ۔لہٰذا عمر ابھی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے اشعار کے مطالعے سے چند باتیں سامنے آتی ہیں۔سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے یہاں بھی بعض دوسرے شاعروں کی طرح ماضی سے دلچسپی ہے۔ نتیجے میں وہ اکثر و بیشتر زمانہ حال اور ماضی میں جو تضاد ہے اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔آج کا ماحول اور ثقافت جن برائیوں سے گزر رہا ہے اور جس میں نئی زندگی کے کتنے ہی ناسور پک رہے ہیں ان پر عطا عابدی کی گہری نظر ہے۔ بہت سے لوگ انہیں گاؤں کا شاعر بھی کہتے ہیں۔ ان کے اشعار دیکھئے:

تو جو آجاتی ہے تو مایوس سا ہوجاتا ہوں
اے مرے گاؤں کی خوشبو تو ادھر مت آنا
یہ عجب شہر ہے انسان نہ ہیں سائے ہیں یہاں
لاکھ ہمدرد ہوں دلی میں مگر مت آنا
(عطاعابدی)

ہوا کے رخ پہ لویں متحد نہیں ورنہ
ابھی چراغوں میں ایسا نہیں کہ جان نہیں

☆☆

اداس بیٹھا ہے آئینہ بیچنے والا
کہ اس محل میں کوئی خود کو جانتا ہی نہیں

ویسے بہار کے کچھ ان شعراء کا نام درج کر رہا ہوں جن کا نام غزل اور نظم کے جدید اور جدید تر وسیلے سے اکثر و بیشتر سامنے آتے رہیں ہیں۔

منظر اعجاز، منیر سیفی، ظفر صدیقی، امام اعظم، کوثر مظہری، اظفر جمیل ، انور ایرج، رسول ساقی، فردوس گیاوی، نازاں جمشید پوری، مشتاق احمد معراج، رعنا، شاہد اختر، منظر سلطان، سرور الہدیٰ، رکن الدین عشق، آیت اللہ جوہری، محبوب احمد عاصی، غلام احمد، اشرف علی فغاں، مغنی غلام مخدوم ثروت، شیخ غلام یحییٰ حضور، شیخ محمد روشن جوشش، احقر بہاری، شاہ ابوالحسن، مرزا علی فدوی، شاہ نورالحق تپاں، غلام علی راسخ، شاہ امان علی ترقی، صغیر بلگرامی، صوفی منیری، شاد عظیم آبادی، شوق نیموی، امداد اثر، مسلم عظیم آبادی، سریر کابری، نصیر الدین حسین نصیر، ولی کاکوی، اختر اورینوی، اجتبیٰ رضوی، عطا کاکوی، محسن دربھنگوی، پرویز شاہدی، رمز عظیم آبادی، احسان دربھنگوی، شاغل قادری، کلیم عاجز، فرحت قادری، سہیل واسطی، ظفر حمیدی، صبا کریمی، منظر شہاب، وہاب دانش، مظہر امام، علقمہ شبلی، حسن آرزو، شاہد احمد شعیت، سید احمد شمیم، شعیب راہی، صابر بنارسی، شمس بلگرامی، ناز قادری، مرتضی اظہر رضوی، شاہین غازیپوری، شفیع مشہدی، مختار احمد عاصی، بسمل سہنساروی، تقی شاعر باقری، سید غضنفر نواب، انیس امام، اویس احمد دوراں، عبدالماجد اختر، سہیل واسطی، شاکر کریمی، اختر یوسف، نسیم مظفر پوری، نسیم الحق فیروز، احمد حسین آزاد، احترام الیقین، اسلم آزاد، اسلام پرویز، شعیب راہی، صابر آروی، شاہد کلیم اور احمد کلیم وغیرہ ہیں۔

الغرض خیال اور اظہار خیال کی سادگی اس دبستان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ یہاں کے شعرا نے تشبیہات و استعارات کے انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ کسی طرح کی پیچیدگی پیدا نہ ہونے پائے۔ فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال ہوا ہے مگر جو اعتدال کے اندر۔ عشقیہ جذبات یہاں بھی شاعری کا موضوع ہے۔مگر پاکیزگی و نفاست ملحوظ رہی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ تصوف کے طرح رجحان نے ایک طرح کا وقار عشقیہ شاعری کو عطا کیا ہے۔

☆☆☆

اکبرالہ آبادی کا نظریۂ فکر اور شاعری

ڈاکٹر ناظم حسین خان

صدر شعبۂ اردو، شیعہ پی۔جی۔کالج لکھنؤ۔Mob:9415968215

ہندوستان کی معاشرت اور طرز بود و باش وغیرہ پر ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی تہذیب و تمدن اس طرح اثر انداز ہوئی کہ آج تک اس کا اثر نمایاں ہے ساری مشرقی تہذیب جو کہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس مغربی سیلاب کی نذر ہو گئی۔ ہندوستان میں مسلمان خاص طور پر اس تہذیب سے اثر انداز ہوئے۔ وہ ماضی کو بھول گئے، حال کا ان کو ہوش نہ رہا۔ مستقبل کی فکر نہ رہی۔ مغربی عورت کا شعار بے باکی، بے حجابی، کلب جانا، غیر مردوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور غیر مردوں کا دل لبھانا اور ایک کتا ضرور پالنا ایسی عورتوں کا تصور فخریہ تھا اور جو عورتیں شرم و حیا کی مرقع تھیں، نیکی و پاک بازی جن کا شعار تھا وہ چراغ خانہ ہو کر رہ گئیں تھیں۔ ہندوستانی عورت سے شادی کرنا گناہ عظیم تھا۔

اکبر نے جب آنکھیں کھولیں تو ان کے سامنے یہ پورا ماحول رشک کر رہا تھا، اکبرؔ حساس دل رکھتے تھے، اپنے گرد و پیش کو دیکھا، خوب دیکھا، خود کو دیکھا، قوم کو پہچانا اور محسوس کیا کہ قوم کا شیرازہ منتشر ہو رہا ہے، قوم کی کشتی ایسے باد باراں میں پھنس گئی تھی جہاں فوراً کسی ناخدا کی تلاش تھی ایسے ہی وقت میں پروردگار نے سرسید احمد خاں کو ناخدا بنا کر بھیج دیا تھا۔ سرسید اور ان کے ادبی رفقاء نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ حالی واعظ ہو گئے اور قوم کا رونا روتے رہے لیکن اتنے آنسوؤں کے بعد بھی ان کے آنسو بے اثر ثابت ہوئے۔ ڈاکٹر اقبالؔ کی نظموں نے بھی خاطر خواہ کام نہیں کیا، نذیر احمد کی ناول نگاری نے قوم کو کش مکش میں ڈال دیا۔ اکبرالہ آبادی نے خوب کیا انہوں نے نہ تو خشک وعظ کئے اور نہ تو پند و نصائح سے کام لیا قوم کی اس حالت پر آنسو بہانے کے بجائے خوب قہقہے لگائے خوب ہنسے اور خوب ہنسایا اور اتنا ہنسایا کہ آنسو نکل پڑے اور اس حالت میں طنز کے نشتر گھونپ دیئے۔

اکبرؔ انگریزی سرکار کے ملازم تھے۔ زبان سے کچھ بھی کہنا محال تھا مگر ذہن رسا اور ذوق سلیم نے رہنمائی کی انہوں نے اشارات، کنایات، تشبیہات و استعارات کا سہارا لیا مختلف القاب کو کردار بنایا۔ بقول اکبرؔ:

انگریز تو ہندوستانیوں کو عہدہ دے کر کٹھ پتلی بنا لیتے ہیں۔

مثلاً:

جج بنا کر اچھے اچھوں کا وہ لبھا لیتے ہیں دل ہیں نہایت خوش نما دو جیم ان کے ہاتھ میں

اکبرؔ کی شاعری اپنے درد کا آئینہ ہے، اکبر نے غزل، مثنوی، قطعہ، رباعی، نظم و مخمس، مسدس تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی، مگر ان کو شہرۂ آفاق، ان کی ظریفانہ شاعری نے بنایا۔ اکبرؔ کی شاعری قومی شاعری ہے لیکن ابتدائی شاعری میں غزل ملتی ہے جو کہ کیف و سرور، معاملہ بندی، برجستگی اور معرفت و توحید سے لبریز ہے۔

اکبرؔ کے کلام میں معاملہ بندی پاکیزگی اور شائستگی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی ہے جیسے:

محروم ہی رہ جاتی ہے آغوش تمنا
شرم آکے چرا لیتی ہے سارا بدن ان کا

اکبرؔ کی شاعری زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے، کوئی بھی ایسا پہلو نہیں ہے کہ جس پر اکبرؔ کی نظر نہ گئی ہو اکبر حقیقی معنوں میں قومی شاعر تھے۔ اکبر کے کلام کی سب سے نمایاں خوبی سچائی، خلوص اور صاف گوئی ہے۔ جیسے:

یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبرؔ
دل میں جو آئے کہہ گذرتا ہوں

اکبرؔ کے کلام کی دوسری اور نمایاں خوبی طنز و مزاح ہے، ظرافت اکبرؔ کے کلام کی روح ہے۔ اردو ادب میں ہم کو اکبر سے پہلے سوداؔ، غالبؔ، انشاء اور اودھ پنچ میں مل جاتی ہے مگر ان کے قہقہوں نے اسے مصنوعی بنا دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ظرافت فشمن کے لیے ایک حربہ ہے جو کہ دشمن کے خلاف مہلک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اکبرؔ کی طنز و ظرافت کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے، اکبر نے ظرافت کے میدان میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ یہاں ظرافت کی چند مثالیں پیش ہیں:

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

لہو سے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

اکبر کی کامیابی ان کی خاص اصطلاحات میں پوشیدہ ہیں جس کی آڑ میں وہ بڑے سے بڑے مطالب بیان کر جاتے ہیں۔ اکبرؔ کے کلام میں شیخ جی لٹ صاحب لیڈر وغیرہ الفاظ پر لطیف پیرایے میں ملتے ہیں۔

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

اکبرؔ نے انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا ہے لیکن نہایت کامیابی کے ساتھ:

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

باغوں میں بہار درختوں کی دیکھ لی
کالج میں آکے کانوکیشن کو دیکھئے

اکبر قافیہ پیمائی کے بادشاہ تھے۔ قافیہ پیمائی کے شوق میں وہ سخت ترین اور دشوار منازل سے بآسانی گذر جاتے ہیں۔

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بیگم کی نوچ سے

اکبرؔ کا خاص موضوع تعلیم نسواں اور بے پردگی ہے ان کے عہد میں جو اندھا دھند مغربی تہذیب کی تقلید ہو رہی تھی اکبر نے اسے مجروح کر دیا یہ کہہ کر ملاحظہ ہو:

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اردو شاعری کی دنیا میں اکبر تاریخی اہمیت کے حامل ہیں وہ اپنے دور کے سچے نمائندے بھی ہیں اور اس کی پیداوار بھی اپنے موضوع بیان کے لحاظ سے ان کی انفرادی حیثیت مسلم ہے۔ وہ اردو کے بے مثال طنز و ظرافت نگار شاعر ہیں فکر عنصر نے ان کی ظرافت کو عظمت بخشی ہے۔ اکبر کی شاعری ان کے عصر کے رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔ اکبر کی شاعری نے ترقی کے لیے مدارج طے کئے، ابتدا میں اکبر اپنے وقت کے مذاق کے مطابق غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اکبر کے ابتدائی کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

اللہ نے دی ہے جو تمہیں چاند سی صورت
روشن کرو جاکر سیہ خانہ کسی کا

اکبرؔ کے اخلاقی مضامین کے اشعار کچھ اس طرح سے ہیں۔

دلوں کا قرب حاصل کیجئے راحت رساں ہوکر
نفس نے سینے میں جا پائی ہے آرام جاں ہوکر

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبرؔ پھول پتوں میں نہاں ہوکر

اکبرؔ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ایسے پیرائے میں کرتے ہیں کہ داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پردہ اور عورتوں کی تعلیم کی مخالفت میں ان کے اشعار کتنے پر اثر ہیں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

اکبرؔ کا طنز اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے جو دلوں پر نشتر کا کام کرتا ہے:

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردی
کہ پردہ کھل گیا اس قوم کے زنانوں کا

پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں جائیں گی غلمان تو ہیں

حسرت بہت ترقیٔ دختر کی تھی انہیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ باہر نکل گئیں

حالانکہ اکبر خود محسوس کرتے ہیں کہ پردے کی پابندی اب قائم رہنے والی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

بٹھائی جائیں گی پردے میں بی بیاں کب تک
بتے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

جو منھ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس
چھپیں گی حضرت حوا کی بیٹیاں کب تک

جناب حضرت اکبر ہیں حامیٔ پردہ
مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

اکبرؔ کی نظر میں پردہ کی پابندی مصلحت کا تقاضہ تھا، وہ کہتے ہیں کہ:

فرض عورت پر نہیں ہے چار دیواری کی قید
ہو اگر ضبط نظر کی اور خودداری کی قید
ہاں مگر خودداری وضبط نظر آساں نہیں
منھ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آسان نہیں

اکبرؔ تعلیم نسواں کے سرے سے مخالف نہیں ہیں خاص حدود کے اندر وہ اس کے حامی ہیں۔ اکبر کہتے ہیں کہ:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم
استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

تعلیم نسواں کے متعلق اکبر کہتے ہیں کہ:

کون کہتا ہے کہ تعلیم زنان خوب نہیں
ایک ہی بات فقط کہتا ہے ہاں حکمت کو

در اسے شوہر واطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

یقیناً اکبر کے خیال میں تعلیم دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ۔۔۔ ملاحظہ ہو:

پبلک میں کیا ضرور ہے جا کر تنی رہو
تقلید مغربی پہ عبث کیوں تھنی رہو
داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

مغرب کے چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

اکبرؔ کی مغربی تعلیم سے مخالفت صرف عورتوں ہی سے نہیں مردوں کے لیے بھی ہے وہ کہتے ہیں کہ:

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

اکبرؔ روزمرہ کی ضروریات میں آنے والی تمام چیزوں میں بھی وہ صرف نقص کا پہلو دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

پیٹ دکھتا ہے آنکھ آئی ہے
شاید ایڈورڈ کی دہائی ہے

اکبرؔ اپنے طنز یہ اشعار سے انگریزی حکومت کی خوب پرلطف خبر لیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ نام ونہاد قومی رہنماؤں کو بھی اپنا نشانہ بنانے سے باز نہیں آتے تھے۔ اکبرؔ کے اشعار ان خیالات کی غمازی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:

بدھوں میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو مشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

اکبرؔ کے فن وفکر ونظر کو انفرادیت حاصل ہے لیکن وہ عظیم فنکار نہیں کہے جاسکتے۔ ان کا کلام ایک مخصوص ماحول اور فضا میں سانس لیتا ہے۔ اپنے عہد کی ترجمانی کرکے وہ لسانی العصر تو بن گئے لیکن ان کا کلام ابدی اقدار سے یکسر خالی ہے ان کے تخیل میں گہرائی کی کمی ہے۔ ان کے کلام میں سطحیت ہے۔ اکبر تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور وہ اپنے موضوع بیان کی وجہ سے انہیں انفرادی حیثیت بھی حاصل ہے۔ لیکن میرؔ و غالبؔ اور اقبالؔ کی طرح وہ بڑے فنکار نہیں ہیں۔

☆☆☆

۱۹۶۰ کے بعد کی خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کا جائزہ

ڈاکٹر شاہینہ عبید خان
(صدر شعبہ عربی، اردو اور فارسی، اسمٰعیل یوسف کالج، جوگیشوری ایسٹ، ممبئی ۶۰)

اردو ادب کی خدمت میں خواتین ابتداء سے ہی پیش پیش رہی ہیں۔ جس سے اردو ادب کی ترقی میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اردو افسانہ نگاری کے میدان میں خواتین نے اپنے تجربات ومشاہدات سے عوام کو روشناش کرانے کی کوشش کی ہیں۔ حالانکہ ابتداء میں خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں رومانی کیفیت اور مافوق الفطرت عناصر ہی موجود ہوتے تھے۔ کیونکہ انہیں سماج کی روش کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا تھا۔ کیونکہ عورت ذات پابندیوں کا شکار تھی۔ پھر بھی ایسے مشکل ماحول میں اپنی صلاحیتوں کے دم پر افسانے تخلیق کرتی رہی ہیں۔ جہاں کہیں بھی ماحول کی جھلک انہیں دکھائی پڑتی، وہ اسے اپنے افسانے کا حصہ ضرور بناتی تھیں جس سے افسانے کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی اور افسانہ فرد ذات سے نکل کر سماجی زندگی کا حصہ بننے لگا۔

اردو افسانہ نگاری میں خواتین افسانہ نگاروں کی بہترین نمائندگی نے عورتوں کو مردوں کے شانہ بہ شانہ اور قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لائق بنایا۔ جس سے بہترین ادب تخلیق ہوتا رہا۔ ایسے ہی ترقی یافتہ ذہن کے حامل افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر رشید جہاں، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، ہاجرہ مسرور، شکیلہ اختر، خدیجہ مستور کی افسانہ نگاری ہے۔ جس سے اردو افسانہ حقیقت سے روشناش ہوا۔ اور متقاضائے حال کی نمائندگی کرنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانے کے موضوعات کو کافی وسعت ملی۔ جس سے دھیرے دھیرے اردو افسانے میں ذاتی خیالات بھی موضوع بننا شروع ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، جیلانی بانو، صالحہ عابد حسین، واجدہ تبسم اور مسرور جہاں ہر طرح کے موضوعات کو الگ الگ ٹیکنک سے منظر عام پر لاتی رہی ہیں۔ جس سے افسانے میں بہت سی نئی ٹیکنک وجود میں آئی۔ تجربات اور ردوقبول کے ساتھ اردو افسانہ ہر طرح کے موضوعات کو سمیٹنے کی روش میں قائم رہا۔ ٹیکنک کا یہی تجربات ومشاہدات اردو افسانہ نگاری کو ترقی کے مراحل طے کراتا رہا۔ اور تجربات کا یہی نکھار جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا حصہ بنا۔ جو 1960ء کے بعد لکھے گئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں ملتا ہے۔ اس ذیل کے افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، نگار عظیم، غزال ضیغم، ثروت خان، صادقہ نواب سحر کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں موضوعات کی سطح پر مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں مسلم معاشرہ اور تہذیب کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ جسے وہ اپنے نسوانی کرداروں کے سہارے پیش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کے لحاظ سے یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مگر افسانے کے تجربات ومشاہدات جدا جدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی پیش کش کا انداز جدا ہوتا ہے۔ جس سے نئے افسانہ نگاروں کو موضوعات کا ایک طرح تنوع حاصل ہوا۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں تانیثی جذبے کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ مگر ان کے محرکات میں انسانی نفسیات، انسانی اقدار، انسانی رشتوں، کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جو صنف نازک کی کیفیات ومسائل کے گرد سے ہو کر گزرتی ہے۔ بعض اوقات کچھ ایسے افسانے بھی تخلیق ہوئے ہیں جو عورت کو چہار دیواری میں قید کر کے ان کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ ایسے خیال کی حامل افسانہ نگاروں میں عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر اور جیلانی بانو کے نام نمایاں ہیں۔ مگر ان میں بھی سب سے زیادہ توانا آواز جیلانی بانو اور عصمت چغتائی کی ہے۔ وہ متوسط طبقہ کے

گھریلو زندگی اور ان کے مسائل کو نہایت ہنرمندی کے ساتھ سامنے لاتی ہیں ۔عصمت چغتائی کے اس طرح کے حامل افسانوں میں ننھی کی نانی، بچھو پھوپھی، چھوئی موئی اور لحاف وغیرہ اہم ہیں ۔جبکہ جیلانی بانو کے اس نوع کے افسانوں میں کلچرا کیڈمی، بہار کا آخری گلاب، اسٹل لائف، بینکما، سونا آنگن، قبل از مرگ بیاں، گل نغمہ، ایک شوٹنگ اسکرپٹ، بھاگو بھاگو، ایک دن لیبر روم میں، نوزائدہ وغیرہ اہم ہیں ۔ جہاں مسلمان گھرانوں کے اندر متوسط طبقہ پوری طرح سے عیاں ہوجاتے ہیں۔انہوں نے ایسے مسائل کو افسانوں میں برتا ہے جس سے قاری کی واقفیت ہی نہیں تھی۔یہی وجہ ہے کہ عصمت چغتائی کے اور جیلانی بانو کے افسانے اپنے اپنے دور میں دلچسپی کا باعث بنے۔ حالانکہ ہر مصنف کے یہاں عورتوں کے مسئلے مسائل موجود تھے ۔مگر عصمت چغتائی نے اور جیلانی بانو نے چھپی ہوئی نبض کو بخوبی پکڑا ہے۔

افسانہ نگاری کے ابتدائی دور میں عورتوں کے حالات ناگفتہ تھے۔وہ چہار دیواری تک ہی قید تھیں اور ہر طرح سے ان کا استحصال ہوتا تھا۔ ایسے استحصال زدہ ماحول میں وہ اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح سامنے نہیں لاسکتی تھیں ۔پھر بھی وہ محدود دائرہ میں رہ کر کے اردو ادب کی خدمت انجام دیتی رہیں۔ایسے ہی دھیمی مگر پرزور کوششوں سے وہ اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئیں۔ انھوں نے سماج سے فرد ذات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔اس طرح اردو افسانہ فرد ذات کے اندر کی تہیں کھولنے لگا ۔ ایسے خیالات کی نمائندگی کرنے والی افسانہ نگاروں میں ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، صالحہ عابد حسین، واجدہ تبسم، مسرور جہاں، صغرای مہدی، بانو سرتاج، ذکیہ مشہدی، نگار عظیم، ترنم ریاض، غزال ضیغم اور ثروت خان وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔قرۃ العین حیدر اور جیلانی بانو نے اس طرز کے حامل افسانوں میں وقت کے بہاؤ کو پکڑا اور اسے اپنے جذبات کے ساتھ جوڑ کر خود سناشائی کی کنجی عطا کی ۔ایسے خیالات کے حامل افسانوں میں روشنی کی رفتار، اگلے جنم موہے بٹیا ہی کیجو، بھاگو بھاگو، ایک شوٹنگ اسکرپٹ وغیرہ خصوصیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس طرح افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں سے وقت کی روایتی ڈگر کو پکڑا ہے ۔ ساتھ ہی عورتوں کی ثانوی حیثیت کو مسترد کر کے وہ مقام عطا کرنے کی کوشش کی جہاں فیصلے کی کنجی اس کے ہاتھ میں آگئی۔

افسانہ نگاری کی اسی ڈگر پر چلتے ہوئے 1960ء کے بعد کی خواتین افسانہ نگاروں نے پوری کوشش کے ساتھ لکھنا شروع کیا اور نفسیاتی، جنسیاتی، سیاسی، معاشی، تعلیمی وغیرہ خیالات کو کامیابی کے ساتھ اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جس کا اثر افسانے کی بُنت پر پڑا، افسانہ عام پلاٹ سے جدا ہوگیا اور خیالات کا بکھراؤ افسانہ نگاری کا حصہ بنا۔ یہی وجہ ہے کہ 1960ء کے بعد کا دور افسانہ نگاری کا پیچیدہ دور مانا جاتا ہے۔اس عہد میں اردو افسانے میں علامتی، تجریدی اور تمثیلی انداز اپنائے جانے لگے۔اس غیر قطعیت کی وجہ سے اردو افسانہ سے قاری کی توجہ کم ہونے لگی۔اس طرح کے افسانے جن میں کہانی کا فقدان ہے، خالدہ حسین اور زاہدہ حنا کے یہاں ملتے ہیں۔قاری کی توجہ کم ہونے کے باعث خواتین افسانہ نگاروں میں ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، صالحہ عابد حسین، واجدہ تبسم اور مسرور جہاں وغیرہ جیسی افسانہ نگاروں نے افسانے کے پلاٹ کو پکڑا جس سے افسانہ ایک بار پھر بہترین نگارشات کے ساتھ جلوہ گر ہوا اور قارئین کی توجہ کھینچنے میں کامیاب رہا جس کا اثر یہ ہوا کہ بعد کے افسانہ نگاروں نے افسانہ نگاری کی اسی روش کو اپنایا ۔ ان تمام افسانہ نگاروں نے افسانے کے فن کو خیال میں رکھتے ہوئے بہترین افسانے تخلیق کئے اور علامتی، تجریدی اور تمثیلی اسلوب میں کہانی لکھنے کا رواج کم ہوا، موضوعات پر توجہ دی گئی، افسانے کی بنیاد یعنی فرد اور سماج کے تعلق کو توجہ میں رکھ کر داخلی کرب اور تنہائی کو موضوع بنایا گیا۔یہی وجہ ہے کہ 1960ء کے بعد کی خواتین افسانہ نگاروں کے فن پاروں میں عورت خانگی زندگی ہی نہیں بلکہ بازار اور دفتر میں بھی نظر آئی۔بعض اوقات تو وہ سیاست اور الیکشن میں بھی آئی۔زندگی کی اصل حقیقتوں کو انہوں نے قبول کیا اور حالات سے نپٹنے کی صلاحیت بھی سیکھی ۔زندگی کو بے بسی کی نذر کرنے کے بجائے ہمت سے لبریز ہوکر اپنے افسانوں میں حرارت بخشی اور قارئین کی توجہ کا مرکز ٹھہری ۔ اس طرح اردو افسانہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ زندگی کی چھپی ہوئی حقیقت کو سامنے لاکر کے قارئین کی ذہنی نشو نما کا فریضہ انجام دیتا رہا۔

1960 کے بعد کی خواتین افسانہ نگاروں کی کوششوں سے افسانہ نگاری کے میدان میں موضوعات کے لحاظ سے کافی توسیع ہوئی۔عورتوں کے جذبات وخیالات اور حالات کو دیکھنے و سمجھنے کا موقع ملا۔اس کے ساتھ ساتھ حقوق نسواں کی آبیاری بھی ہوئی۔اتنا ہی نہیں وسیع پیمانہ پر ان کی ذہنی نشونما بھی ہوتی رہی۔ یہ نشونما صرف عورتوں کے لئے ہی نہیں بلکہ مردوں کے لئے بھی کار آمد ثابت ہوئی۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ماں ہی تربیت کی پہلی درسگاہ ہوتی ہے۔ اس لئے مرد و زن دونوں کی رہنمائی ان خواتین افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ذریعہ ہوتی رہی۔اس طرح کے خیالات کے

اظہار میں بانو سرتاج کا افسانہ ''دائروں کے قیدی''، ''پاگل خانہ''، ''ایک گھونٹ زہر''، ''اجڑی کوکھ کا بوجھ''، ''نہ غم تیرا نہ غم میرا''، ''تیرے راستے کے مسافر''، ''کھویا ہوا سکھ'' وغیرہ اہم ہے۔ان افسانوں میں بانو سرتاج عصری زندگی کی تمام پیچیدگیوں کو نہایت فنکاری کے ساتھ سامنے لاتی ہیں۔ جو امید نا امیدی ، انتظار اکتاہٹ ، انسانی انتشار اور بحرانی کیفیت کی صورت حال کی بکھری کڑیوں کو سمیٹ لینے کا آرٹ تمام تر کیفیات کے ساتھ افسانے کے افق پر نمودار ہوتی ہیں ۔ان کے افسانے ''دائروں کے قیدی'' میں بھی انسانیت کے نمو کو تار تار ہوتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''سحر سوچ رہی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے دائروں میں قید ہوتا ہے، اس سے باہر وہ نہیں جاتا، جا نہیں سکتا۔ جانا نہیں چاہتا ،دائروں کے یہ قیدی صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں ،اپنا بھلا چاہتے ہیں۔دوسروں سے انہیں کیا ہے۔''(۱)

اس افسانے میں واضح طور پر انسانیت کی نمو کی تصویر کشی کی گئی ہے ۔انسان اپنی فطرت کا قیدی ہوتا ہے، وقت رہتے ہی انہیں موڑا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ذکیہ مشہدی کے افسانوں کا تعلق ہے تو وہ اپنے دلی کیفیت سے تجربات کے ردوقبول کو مرکز بناتی ہیں۔ ان کے اس طرز کے افسانوں میں ''پرائے چہرے''، ''ایک تھکی ہوئی عورت''، ''آنٹی ایملی''، ''مہمان''، ''چرایا ہوا سکھ'' میں ایک عورت کے دکھ کے ساتھ ساتھ اپنے ردوقبول کے جذبات وخیالات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ان کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے احمد صغیر لکھتے ہیں کہ:

''وہ اپنے افسانوں میں صرف متوسط اور کمزور گھرانے کی تصویر نہیں کھینچتی بلکہ ہائی سوسائٹی میں زندگی گزارنے والی عورتوں کو بھی صفحہ قرطاس پر فنکاری کے ساتھ اس کی تصویر ابھارتی ہیں۔وہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتی ہیں محسوس کرتی ہیں۔نیز عصری آگہی اور سماجی معنویت کو خود اپنے تجربے اور غور وفکر کا حصہ بنا کر افسانے میں بڑی فنکاری سے ڈھال دیتی ہیں۔''(۲)

نگار عظیم نے اپنے افسانوں میں جذبات کے رشتوں کو جگہ دی ہے۔جو انسانی فطرت کی تہوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ جو خیالات کو تجربات میں داخل کر کے تمازت بخشتا ہے۔جس سے انسانی پیکر تراشی کا بھی درس ملتا ہے۔ان کے اس طرز کے افسانوں میں جن میں انسانیت سوز حرکات کو موضوع بنایا گیا ہے ''کہن''، ''حرم''، ''جشن''، ''زندگی زندگی''، ''بیل'' وغیرہ اہم ہیں۔ان افسانوں میں جذبات کا جراتمندانہ قدام دیکھنے کو ملتا ہے، ساتھ ہی حوصلہ و درس بھی۔اس کے علاوہ جن افسانوں میں انہوں نے انسانی رشتوں کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے، وہ ہیں فرض، کنفیشن ، زاہدہ مقدس، وغیرہ۔

ان تمام افسانہ نگاروں میں جو نام بہت جلد افسانے کی افق پر اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوا ہے، وہ ہے ترنم ریاض کا۔ترنم کے افسانے زندگی کی عام روش سے الگ سرمستی لئے ہوئے ہوتے ہیں ۔ جو عام خیال کے ساتھ متاثر کن گوشۂ عافیت میں داخل ہوتی ہیں جو سرمستی کے ساتھ ابھرتا ہے۔ زندگی کی ٹھوس سے ٹھوس حقیقت کو بھی سرمستی کے ساتھ ضم کر کے حوصلے کے ساتھ جینے کا ہنر دیتی ہیں۔ان کے اس طرز کے افسانوں میں باپ، اماں، شہر، ابابیلیں لوٹ آئیں، متاع گم گشتہ، بابل، برف گرنے والی ہے ، میرا پیا گھر آیا وغیرہ خصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ۔ ان میں گھر آنگن کے ساتھ زندگی اور معاشرے کا مقام نمایاں ہیں۔

اردو افسانہ میں عصمت کے بعد اگر بے باکی اور عریانی میں کسی کا نام لیا جائے تو وہ نام ہے غزال ضیغم کا۔وہ اپنے افسانوں میں بے باک معاشرے کی نمائندگی کرتی ہیں جن سے ان کے اس طرز کے افسانوں میں نیک پروین، فیڈ آؤٹ فیڈ آن، مدھوبن میں رادھیکا اور ایک ٹکڑا دھوپ کا وغیرہ اہم ہیں۔عہد حاضر میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے والی افسانہ نگاروں میں ثروت خان کا نام بھی قابل ذکر ہے۔انہوں نے بہت سے ایسے افسانے لکھے ہیں جو سوالیہ نشان بن کر سماج کا احاطہ کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔مرد اور عورت کو ایک برابر کا حق نہ ملنا جس سے عورت کی ترقی کی راہیں سکڑ جاتی ہیں ، وہ عورت کو بازار ، دفتر ، سیاست ، فرقہ واریت ، سبھی موقعوں پر یکجا دیکھنا چاہتی ہیں ۔ان کے اس طرز کے افسانوں میں مردانگی ، میں مرد مار بھلی ، لوک عدالت ، ذروں کی حرارت ، سمرپن ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان تمام افسانہ نگاروں نے زندگی کی ہر اس روش کو سامنے لایا ہے جس سے سماج بے بہرہ تھا۔ان کی اس کوشش سے زندگی پر لوگوں کی پکڑ مضبوط ہوئی اور زندگی ایک تابناک انداز میں جلوہ گر ہونا شروع ہوئی۔

حواشی:

(۱) کتاب کا نام، دائروں کے قیدی، مصنفہ: بانو سرتاج، سن اشاعت: ۲۰۱۷، صفحہ نمبر، ۱۱۷

(۲) اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ کے بعد، مصنف :ڈاکٹر احمد صغیر، سن اشاعت ۲۰۰۹، صفحہ نمبر، ۲۵۶

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اسداللہ کی انشائیہ نگاری

تبسم آراء

(ریسرچ اسکالر، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد)

ہندوستان سے انشائیہ نگاری کی تحریک میں شامل ہونے والے ادیبوں میں احمد جمال پاشاہ اور رام لعل نابھوی کے بعد تیسرا نام محمد اسداللہ کا ہے۔ محمد اسداللہ 1958ء کو ضلع امراوتی کے گاؤں وروڈ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت ایک تہذیب یافتہ گھرانہ میں ہوئی اور آگے چل کر ناگپور میں پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ ابتداء میں ماہنامہ شگوفہ حیدرآباد میں طنزیہ ومزاحیہ مضامین لکھے۔ ان ک دیگر تحریروں میں بھی انشائیہ نگاری کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کی تحریک سے وابستگی کے بعد ایک نیا انداز محمد اسداللہ کی تحریروں میں نمایاں ہوا۔ ان کے بیشتر انشائیے ماہنامہ اوراق، ادبِ لطیف اور تخلیق میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے تین مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ انشائیوں کا پہلا مجموعہ 1991ء میں ''بوڑھے کے رول میں'' مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ اِس کتاب میں 15 انشائیے شامل ہیں۔ اِس مجموعہ کا پیش لفظ وزیر آغا نے تحریر کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''پاکستان میں انشائیہ نگاری ایک تحریک کی صورت اختیار کرچکی ہے؛ جبکہ بھارت میں تاحال صرف تین انشائیہ نگاروں نے اِس میدان میں قدم رکھا ہے۔ اِن میں دو منجھے ہوئے ادیب یعنی احمد جمال پاشاہ اور رام لعل نابھوی ہیں، اور تیسرا نوجوان انشائیہ نگار محمد اسداللہ ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں کہ:

> ''محمد اسداللہ نے گہری سے گہری بات کے بیان میں بھی تازہ کاری اور اُپج کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے ہاں ندرتِ خیال ہے جو بنے بنائے تراشیدہ اقوال کی پیوست پر ہمیشہ سے کندہ ذہن رہی ہے۔ اس نے زندگی کو دوسروں کی نہیں خود اپنی نظر سے دیکھا ہے اور اسی لیے اِس کے ہاں ردِّعمل شخصی اور ذاتی نوعیت کا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ اور انشائیہ نگاری کے سلسلہ میں اِس بات کی بڑی اہمیت ہے۔'' [1]

محمد اسداللہ کی دوسری تصنیف ''پُرزے'' 1992ء میں منظرِ عام پر آئی جو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ اِس تصنیف میں طنزیہ ومزاحیہ مضامین، انشائیہ اور خاکے شامل ہیں۔ اِس کتاب کا مقدمہ یوسف ناظم نے تحریر کیا ہے۔

ان کا تیسرا مجموعہ ''ہوائیاں'' جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر شدہ طنزیہ ومزاحیہ مضامین اور انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب 1998ء میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں 18 طنزیہ مضامین وانشائیے شامل ہیں۔ محمد اسداللہ کا تحقیقی مقالہ ہے، انشائیوں کی روایت مشرق ومغرب کے تناظر میں؛ اِس میں اِنہوں نے نہ صرف انشائیہ کیتاریخ قلمبند کی ہے بلکہ انشائیوں کا بھی بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ اِنہوں نے انگریزی اور مراٹھی کے انشائیہ سے بھی اِستفادہ کیا ہے۔ وہ مراٹھی مزاحیہ ادب کے مترجم کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ اُن کے انشائیے آئے دن پاکستان سے شائع ہونے والے رسائل اوراق، ادبِ لطیف، امریکہ سے دستک، ہندوستان سے شاعر آجکل، ایوانِ اُردو، جواز، تعمیر، شگوفہ، آہنگ وتحریک وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے شعور کی پختگی کا اندازہ ان کے مشہور ومعروف انشائیوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے؛ اِقتباس دیکھیے:

''کل ہی کی بات لیجئے..... میں اپنے آپ سے وفاداری کا تہیہ کر کے اپنے اندر اُترا۔ اور آواز لگائی۔ اے میرے! ''میں'' ذرا باہر آئیں۔ تیرا وفادار بن کر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ ایک لمحہ کے توقف سے ایک انتہائی نحیف ولاغر بوڑھا لاٹھی ٹیکتا ہوا باہر آیا۔ میں اِسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اِس بوڑھے کی طرح جس کی اولاد نا خلف نکل گئی ہو'' ۲؎

ایک اور انشائیہ نافرمانی کا اقتباس ہے:

''نافرمانی ایک سکہ ہے۔ جس کا دوسرا پہلو یقینا فرمانبردار ہے۔ یہاں کی فرمانبرداری والا پہلو نفسیاتی خباثت میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید اِسی لیے خدا نے انسان کو بھی نافرمانی کے آلات سے لیس کیا تھا؛ تاکہ اُسے خیر و شر میں تمیز کرنے کی صلاحیت حاصل ہو سکے۔ فرشتے عبادت کے ذریعہ اپنا دفاع تو کر سکتے تھے البتہ یقین کی سطح پر خدا کی ذات کے اثبات کی ایک ارفع صورت یہ قرار پائی کہ خدا کے ماسواء کی نافرمانی (نفی) کی جائے؛ تاکہ خدا کی ذات کے اثبات خود بخود نمودار ہو جائیں۔'' ۳؎

محمد اسداللہ کے انشائیوں کے عنوانات ہی نئے انشائیہ نگاروں کے موضوعات سے مماثلت رکھتے ہیں؛ مثلاً: چوہوں سے نجات کی خاطر..... پریس کیے ہوئے کپڑے..... انڈا اور لحاف وغیرہ۔ محمد اسد اللہ کے انشائیہ بخار سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''بخار دراصل ایک مراقبہ ہے جس میں آدمی پر انکشاف کے نت نئے دروازے کھلتے ہیں۔ بخار میں جہاں مریض کو بُرے بُرے خواب دکھائی دیتے ہیں وہیں کچھ حقیقتیں بھی اس کے سامنے دست بستہ حاضر ہوتی ہیں۔ منجملہ ان حقائق کے اس کی بے بسی، بے بضاعتی اور بے مصرفی بھی ہے۔ اس کے سامنے اس کی شخصیت کے دونوں پہلو آئینہ ہو جاتے ہیں کہ وہ جتنا کارآمد سمجھا جاتا ہے وقت پڑے تو اُتنا ہی ناکارہ بھی ہے''۔ ۴؎

عموماً عام اور صحت مند آدمی چست، چاق و چوبند رہتا ہے۔ لیکن جب بیمار ہو جاتا ہے۔ اور بخار وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کو اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا رعب اور باقی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور اس کو اپنی حقیقت کی پہچان ہو جاتی ہے کہ آدمی کس طرح بے بس اور ناکارہ ہے جو دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی بیماری اسے اپنی اوقات یاد دلاتی ہے۔ بقول شاعر:

ارے ماٹی کے پتلے تجھے کتنا گمان ہے
تیری اوقات کیا تیری کیا شان ہے

حوالہ جات:

۱؎ ڈاکٹر وزیر آغا / پیش لفظ بوڑھے کے رول میں/محمد اسداللہ/۱۹۹۱ء ص ۶

۲؎ محمد اسد اللہ/ بوڑھے کے رول میں انشائیہ/۱۹۹۱ء

۳؎ انشائیہ نافرمانی/محمد اسد اللہ/ ص ۳۱۵۔۳۱۴/ فبروری ۲۰۱۵ء انشائیہ آزادی اور افکار/مومن پورہ ناگپور

۴؎ محمد اسد اللہ/ بخار/ بوڑھے کے رول میں/ص ۶۲/۱۹۹۱ء

☆☆☆

بقیہ ص ۴۱ کا

دوست نوازی کو رباب رشیدی لازم سمجھتے تھے۔ خاطر مدارات میں اہتمام اور خلوص سے کام لیتے تھے۔ انھوں نے جو نظمیں کہیں وہ نہ صرف قابل تعریف بلکہ یاد رکھنے اور برابر پڑھتے رہنے والی ہیں۔ ''نیا دور'' کے ۶۰/ سال مکمل ہونے پر انھوں نے جو نظم کہی تھی، وہ جتنی سچی ہے، اتنی ہی اچھی بھی ہے۔ کوئی ایک بند لکھنے یا پڑھنے سے کام نہیں چلے گا۔ بلکہ پوری نظم پڑھنا ہی ہوگی۔ نظم کے چار مصرعوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نظم کتنی پُر اثر ہے ؎

ہمارے ملک و قوم کا مزاج آشنا ہے یہ
کھلائے باغ باغ پھول ایسی اک ضیاء ہے یہ
ہر ایک اپنا عکس پائے ایسا آئینہ ہے یہ
یہ اور بھی بلند کتنا ہوگا دیکھنا ہے یہ

چونکہ میں بھی اب سب کچھ بھولتا جا رہا ہوں، اس لیے رباب رشیدی کا یہ شعر یاد آتا رہتا ہے ؎

رعنائی حیات مجھے ڈھونڈھتی ہے اب
خود کو کبھی جب رباب میسر نہیں ہوں میں

اسرار الحق مجاز پر بھی رباب رشیدی نے اپنے انداز میں سچی باتیں کہہ کر جس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ بھی ان کی فنکاری کا ایک اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

علی جواد زیدی کے سلسلہ میں رباب رشیدی نے ایک اچھی نظم لکھ کر پر خلوص طور سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ درحقیقت وہ ایک اچھے، سچے، حساس اور باشعور قلم کار کی طرح حالات حاضرہ پر نظر رکھنے والے انسان تھے۔ ہر وقت اظہار خیال کو ضروری سمجھتے تھے۔ اسی لیے اُن کے کلام میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو کہ کامیابی کی دلیل ہوا کرتا ہے۔ انھوں نے بلاضرورت جدت طرازی کو کبھی مفید نہیں سمجھا، اسی لیے ان کی شاعری میں ابہام نہیں بلکہ سچی بات کو آسانی اور اطمینان سے کہہ دینا ہی ان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

☆☆☆

مرزا غالبؔ کا سفرِ کلکتہ اور اس کے محرکات: ایک جائزہ

سفیان احمد انصاری

(ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ۔ موبائل نمبر: 9839574196)

مبدأِ فیاض نے اس جہانِ آب وگل میں کچھ ایسی نادر اور چنیدہ شخصیات کو پیدا فرمایا ہے جن سے چند شہر یا چند ملک ہی نہیں بلکہ پورا عالم متعارف ہے اور جن کے کارناموں سے دنیا واقف ہے، جنھوں نے اپنی حیات میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ دنیا ہمیشہ انھیں یاد رکھے گی اور رہتی دنیا تک ان کی خدمات کو داد و تحسین پیش کرتی رہے گی۔ ایسی ہی عظیم ہستیوں میں مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی ہیں۔

مرزا غالبؔ (۱۸۶۹-۱۷۹۷) نے اپنی پوری زندگی میں سوائے کلکتہ کے اور کوئی لمبا سفر نہیں کیا۔ کلکتہ جانے کا پس منظر یہ ہے کہ مرزا غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں انگریز گورنمنٹ میں چار سو سواروں کے رسالدار تھے جس سے انھیں سترہ سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بھرت پور کے قریب دو پرگنوں پر فوج کشی کر کے قبضہ کر لیا تھا، لارڈ لیک مرزا نصر اللہ بیگ کی اس بہادری سے بہت خوش ہوا تھا اور دونوں پرگنے تاحیات جاگیر میں دے دیا تھا، جس سے مرزا نصر اللہ بیگ کو سوا لاکھ روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی، اسی درمیان مرزا نصر اللہ بیگ کو ہاتھی سے گر جانے کی وجہ سے اس قدر چوٹیں آئیں کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ لارڈ لیک نے اُن کے وارثوں سے وہ دونوں پرگنے واپس لے لئے اور پسماندگان کے لئے پنشن مقرر کر دی۔ پسماندگان میں مرزا نصر اللہ بیگ کی والدہ اور تین بہنیں، مرزا غالبؔ اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف (کل چھ افراد) تھے۔

4/مئی 1806ء کو لارڈ لیک نے یہ فیصلہ کیا کہ نواب احمد بخش خاں پچاس سواروں کا ایک دستہ رکھیں گے جس پر پندرہ ہزار سالانہ خرچ کریں گے اور دس ہزار روپے سالانہ نصر اللہ بیگ کے پسماندگان کو بطور وظیفہ دیں گے۔ لیکن لارڈ لیک کے اس فیصلے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نواب احمد بخش خان نے نصر اللہ بیگ کے پسماندگان کی سالانہ رقم دس ہزار روپے گھٹا کر پانچ ہزار روپے کر دی، اور ستم بالائے ستم یہ کہ مذکورہ بالا پسماندگان میں ایک ملازم خواجہ حاجی کو بھی شامل کر دیا اور اس کو بھی دو ہزار روپے سالانہ دینا شروع کر دیا۔ اس طرح مرزا نصر اللہ بیگ کی والدہ اور تین بہنوں کو ڈیڑھ ہزار روپے اور مرزا غالبؔ اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ کو ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ دینے لگے۔ اس وقت مرزا غالبؔ کی عمر نو برس تھی۔

جب مرزا غالبؔ نے کچھ ہوش سنبھالا تو انھیں اس بے ایمانی کا علم ہوا، تو وہ بڑے فکرمند ہوئے، ان کی خواہش یہ تھی کہ ہمارا وظیفہ سالانہ پانچ ہزار نہیں بلکہ دس ہزار ہونا چاہئے، اور خواجہ حاجی سے ان کا کوئی رشتہ نہیں، پھر ہمارے حق میں سے انھیں کیوں حصہ دیا جا رہا ہے۔ بلکہ سالانہ دس ہزار روپیوں میں ان کو شامل نہیں کرنا چاہئے۔

مرزا غالبؔ نے جب نواب احمد بخش خاں کی خدمت میں بذریعہ خط اپنا مطالبہ پیش کیا تو انھوں نے جواب میں قسم کھا کر کہا کہ میں کیا کر سکتا ہوں، میں عزت مآب جنرل صاحب بہادر کو بتا چکا ہوں کہ خواجہ حاجی، مرزا نصر اللہ بیگ کے پسماندگان اور عزیز و اقارب میں شامل نہیں ہیں اس لئے اب تم کچھ دن صبر کرو۔ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد یہ دو ہزار روپے تم دونوں بھائیوں کو دے دیا کروں گا۔ لیکن جب خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا تو وہ دو ہزار روپے

نواب احمد بخش خاں کے وعدہ کے مطابق مرزا غالبؔ اور ان کے چھوٹے بھائی کو ملنے کے بجائے خواجہ حاجی کی اولاد کو ملنے لگے۔ مرزا غالبؔ غصے میں نواب احمد بخش خاں کے پاس الور گئے تو نواب فیروز پور گئے ہوئے تھے۔ پھر جب دوبارہ مرزا غالبؔ دادرسی کے لئے فیروز پور گئے تو نواب احمد بخش خان الور گئے ہوئے تھے ،کچھ دن انتظار کرنے کے بعد واپس دہلی لوٹ آئے، اس دوڑ بھاگ کی وجہ سے مرزا غالبؔ کو سخت جسمانی اور ذہنی اذیّت کا سامنا کرنا پڑا۔

کچھ دنوں بعد مرزا غالبؔ پھر فیروز پور گئے اور نواب احمد بخش خاں سے کہا کہ خواجہ حاجی کا انتقال ہوگیا ہے، اب ہمارا حق ہمیں ملنا چاہئے، تو نواب نے سسکیاں بھر کر رونا شروع کر دیا اور کہا کہ برخوردار! تم میرے بچے اور میری آنکھوں کا نور ہو۔ کچھ دن اور انتظار کرلو تمام حقوق بحال کردئے جائیں گے۔ یہ سن کر مرزا غالبؔ بجھے دل سے واپس دہلی لوٹ آئے۔

انھیں دنوں مرزا کا چھوٹا بھائی مرزا یوسف دماغی عارضہ میں مبتلا تھا جس کے علاج ومعالجہ اور دیکھ بھال میں پنشن میں سے چھ سو روپئے سالانہ خرچ ہوجاتے تھے صرف نو سو روپئے بچتے تھے جس کے سبب مرزا غالبؔ اُن دنوں بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کررہے تھے، ادھر جب غالبؔ کو ساری تگ ودو کے بعد نواب احمد بخش خاں سے کوئی امید باقی نہ رہی تو انھوں نے دہلی کے ریزیڈنٹ چارلس مٹکاف سے شکایت کرنا مناسب سمجھا، اُن دنوں غالبؔ فیروز پور میں تھے وہیں انھوں نے یہ خبر سنی کہ چارلس مٹکاف کانپور آنے والے ہیں تو غالبؔ اس امید پر کہ کانپور میں چارلس مٹکاف سے مل کر اپنی عسرت وتنگ دستی کی ذلت بھری داستان گوش گزار کرنے اور انصاف حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا، چنانچہ مرزا غالبؔ فیروز پور سے فرخ آباد ہوتے ہوئے کانپور پہنچ گئے، کانپور پہنچتے ہی اس قدر بیمار پڑ گئے کہ ملنے جلنے کی بھی طاقت نہیں رہی، کانپور میں اچھا طبیب نہ ہونے کی وجہ سے دریائے گنگا کو عبور کر کے لکھنؤ جانا پڑا، لہٰذا کانپور میں چارلس مٹکاف سے مرزا غالبؔ کی ملاقات نہیں ہوسکی۔ مرزا لکھنؤ میں تقریباً پانچ مہینے بستر علالت پر پڑے رہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالبؔ اپنا معاملہ حکومت عالیہ میں نہیں لے جانا چاہتے تھے بلکہ دہلی کے ریذیڈنٹ چارلس مٹکاف سے مل کر اپنے حق کا حصول اور انصاف چاہتے تھے، اس لئے وہ دہلی سے کلکتہ کے ارادے سے نہیں نکلے تھے۔ بلکہ کلکتہ جانے کا ارادہ لکھنؤ میں اُس وقت کیا جب کانپور میں چارلس مٹکاف سے ملاقات کرنے میں ناکام رہے۔

ادھر لکھنؤ میں جب معتمدالدّولہ سید محمد خاں بہادر عرف آغا میر کو مرزا غالبؔ کے لکھنؤ آمد کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے مرزا غالبؔ سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا، مرزا غالبؔ نے بھی ملاقات کا موقع غنیمت سمجھا کیونکہ ان دنوں انھیں روپیوں کی سخت ضرورت تھی اس لئے راضی ہوگئے، لیکن ملاقات کے لئے مرزا غالبؔ نے یہ شرط لگا دی کہ جب وہ معتمدالدّولہ کی خدمت میں حاضر ہوں تو معتمدالدّولہ کھڑے ہوکر ان کا استقبال کریں، معانقہ کریں اور غالب کو نذر پیش کرنے سے معاف رکھیں۔ معتمدالدّولہ کو یہ شرائط منظور نہیں تھیں اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔

پھر بعد صحت یابی مرزا غالبؔ 26 ذیقعدہ 1242ھ مطابق 21 جون 1827ء بروز جمعہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے اور چوتھے روز کانپور پہنچے، جہاں کچھ دن آرام کرنے کے بعد کلکتے کے ارادے سے باندہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ کانپور سے فتح پور تک کا سفر غالباً یکّے کے ذریعے ہوا، اور چار پانچ دن میں باندہ پہنچ گئے جہاں بغرض علاج چھ مہینہ گزارنا پڑا، پھر باندہ سے مودہا تک بیل گاڑی سے اور چلہ تارا سے الٰہ آباد تک بذریعہ کشتی سفر کیا؛ اور 27 نومبر 1828ء بروز منگل الٰہ آباد پہنچے۔ سفر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مرزا غالبؔ ایک خط میں لکھتے ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"مختصر یہ گردونِ دوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر میں نے خود کو دریا میں ڈال دیا یعنی اس مقام سے میں نے کشتی کرائے پر لی۔ تمام سامان گھوڑے اور ساتھ چلنے والے لوگوں کو کشتی میں بھر کر بسم اللہ مجریہا ومرسٰہا پڑھ کر دریائے جمنا میں سفر کررہا ہوں۔ میں بنارس میں جو وقت گزارنا چاہتا تھا اب ارادہ ہے کہ وہ الٰہ آباد میں گزاروں۔ یہاں چند روز آرام کر کے ضروری سامان فراہم کرنے کے بعد آگے کا سفر شروع کردوں۔ اور پھر مرشد آباد اور بنگال کے سوا کہیں اور قیام نہ کروں۔ دریا کے سفر کا حال دو تین دن میں معلوم ہوجائے گا۔ کشتی بان کہتے ہیں کہ تین دن میں الٰہ آباد پہنچ جائیں گے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آج چہار شنبہ ہے، آدھا دن گزر چکا ہے۔ کشتی میں بیٹھا ہوا، ناخدا سے نہیں، خدا سے دل لگائے ہوئے ہوں۔"

(نامہ ہائے فارسی غالب،ص ۴۱)

مرزا غالبؔ نے اپنے ارادہ کے برخلاف الٰہ آباد میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ قیام نہیں کیا ۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مرزا غالبؔ کو اس سفر میں دو واقعے پیش آئے ۔ایک تو کلکتہ میں اور دوسرا الٰہ آباد میں ۔جیسا کہ مالک رام تحریر کرتے ہیں:

"غالب کے ایک فارسی قصیدے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس سفر میں دو ہنگامے پیش آئے ۔ پہلا الٰہ آباد میں، دوسرا کلکتے میں ۔الٰہ آباد والے قضیہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا ۔ہاں کلکتے کے معرکے سے متعلق ان کی تحریروں میں کافی تفصیل موجود ہے۔" (مالک رام ۔ ذکرِ غالب،ص ۷۵)

بہرحال ایک دن اور ایک رات الٰہ آباد میں قیام کرنے کے بعد غالبؔ بنارس کی طرف روانہ ہو گئے، پہلے کرائے کی بیل گاڑی سے گنگا کے ساحل تک پہنچے ،پھر گنگا پار کر کے بنارس پہنچ گئے۔ جب بنارس پہنچے تو وہاں مشرق سے بادۂ جاں فزا اور نسیمِ سحر چل رہی تھی جس سے مرزا غالبؔ کی جان میں توانائی آئی اور دل کو طمانیت نصیب ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ مرزا غالبؔ نے ایک خط میں بنارس کی تعریف فرمائی ہے۔

بنارس مرزا غالبؔ کے لئے بہت موزوں اور راحت فزا تھا، جہاں کا ٹھنڈا پانی ، ٹھنڈی ہوائیں اور درختوں کا راحت بخش سایہ غالبؔ جیسے مہینوں کے بیمار شخص کے جسم اور روح دونوں کے لئے مرہم ثابت ہوا۔ اسی وجہ سے مرزا غالبؔ نے بنارس کی تمام روحانی اور مادّی خوبیوں کا احاطہ ایک سو آٹھ شعروں پر مشتمل مثنوی "چراغِ دیر" میں کیا ہے جس سے اچھا خراج عقیدت بنارس کے لئے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔مثنوی کے ابتدائی اشعار درج ذیل ہیں:

خموشی آج دمسازِ فغاں ہے
نفس پر صورِ محشر کا گماں ہے
شرر ساماں رگِ خارا صفت ہوں
غبار آسا خرابِ شش جہت ہوں
زباں پر روح فرسا ایک بیاں ہے
نفس خوں ہے ، جگر آتش بجاں ہے
گلہ ہے دوستوں کی بے رخی سے
کتاں سینہ سپر ہے چاندنی سے
وہ گوہر ہوں جو دریا سے جدا ہے
وہ جوہر جس کو آہن نے تجا ہے

پھر بنارس کی تعریف یوں فرماتے ہیں:

نظر میں آج اک ایسا چمن ہے
جو رنگ و نور و نکہت کا وطن ہے
وہاں تک جب سے پائی ہے رسائی
نگہ کو دعویِ گلشن ادائی
یہ اس کے وصف کا فیض نمو ہے
زباں جنت طرازِ گفتگو ہے
بنارس نام اس کا چشمِ بد دور
بہشتِ خُرّم و فردوسِ معمور
مناظر اس کے ہیں اتنے دل افروز
سلام آتے ہیں دلّی کے شب و روز

دوسرے مقام پر بنارس کی تعریف میں مرزا غالبؔ اس طرح رطب اللّسانی فرما رہے ہیں:

بنارس شاہدِ رنگیں قبا ہے
یہ گنگا اس کا گویا آئینہ ہے
فلک نے رکھ کے حسن اس کا نظر میں
جڑا ہے آئینہ سورج کا زر میں
خدا رکھے یہ شانِ حسنِ کامل
نہیں جز آئینہ جس کا مقابل
یہ جلوہ گاہِ حسنِ لاابالی
جہاں میں ہے مثالِ بے مثالی
خوشا گنگا میں یہ پرتو فشانی
بنارس خود بنا ہے اپنا ثانی
کہ ہے ارژنگِ چیں میں سحر ایسا
نہ ہے دنیا میں کوئی شہر ایسا

مرزا غالبؔ بنارس میں تقریباً چار ہفتہ قیام کرنے کے بعد جو گھوڑا بانده یا مودہا میں خریدا تھا ؛اور جسے کلکتہ پہنچنے کے بعد ڈیڑھ سو روپئے میں فروخت کر دیا تھا ،اسی گھوڑے پر سوار ہو کر بذریعہ سڑک پٹنہ پھر مرشد آباد پہنچے ،اور وہاں سے کلکتہ تک گھوڑے سے ہی سفر کیا۔ بالآخر دلّی سے فیروز پور، کانپور، لکھنؤ بانده، الٰہ آباد، بنارس، عظیم آباد (پٹنہ) اور مرشد آباد ہوتے ہوئے کلکتے تک کا تقریباً تین ہزار کلومیٹر کا دشوار گزار سفر گھوڑے ، یکّے ، بیل گاڑی اور کشتی کے ذریعے طے کر کے 19 یا 20 فروری 1828ء مطابق 3 یا 4 شعبان 1243ھ بروز سہ شنبہ کو غالب کلکتہ پہنچ گئے۔

جس مقصد کے تحت مرزا غالبؔ نے کلکتہ کا اتنا طویل اور دشوار گزار سفر طے کیا وہ مقصد پنشن کا مقدمہ اور قضیہ سپریم گورنمنٹ میں پیش کرنا تھا جس کے بارے میں اسٹرلنگ صاحب سکریٹری گورنمنٹ ہند نے یہ یقین دلایا اور وعدہ کیا تھا کہ آپ کا آپ کا حق ضرور ملے گا ، دہلی کے رزیڈنٹ نے دہلی میں یہ اقرار اور وعدہ کیا تھا کہ آپ کی پنشن کی رپورٹ میں صحیح اور درست پیش کر دوں گا ،آپ کلکتہ جا کر اپنا استغاثہ پیش کریں ۔چنانچہ وہاں انھوں نے اپنی درخواست گورنر جنرل کی خدمت میں 28/اپریل 1828ء کو پیش کی تو انھیں دفتر سے یہ حکم ملا کہ یہ درخواست تو پہلے دہلی میں رزیڈنٹ کے سامنے پیش ہونی

چاہئے ۔مرزا غالبؔ نے اپنے ایک متعلق کے واسطے سے دس ماہ کے طویل انتظار کے بعد دہلی سے اپنے موافق رپورٹ حاصل کرلی، لیکن رپورٹ بھیجنے والے ایڈورڈ کول بروک جلد ہی غبن وغیرہ کے جرم میں معزول ہوگئے اوراس کی جگہ فرانسس ہاکنس ریزیڈنٹ مقرر ہوا جس نے مرزا کے دعویٰ کے برخلاف دوسری رپورٹ بھیج دی کہ مرزا کا دعویٰ غلط ہے اوران کو جو پنشن مل رہی ہے وہ بالکل درست اور صحیح ہے ۔ اسی طرح لارڈ لیک کے سابق سکریٹری سرجان میلکم گورنر بمبئی سے جب مرزا غالبؔ کے معاملے میں استفسار کیا گیا تو اس نے بھی مرزا غالبؔ کو غلط بتایا، حاصل یہ کہ سوائے ناامیدی اور مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ لگا۔ بالآخر مرزا غالبؔ نے ولایت میں اپیل کی مگر وہاں سے بھی کچھ بھلا نہ ہوا۔

دراصل مرزاؔ کے مطالبات پانچ تھے: ایک تو یہی کہ گورنمنٹ کی مقرر کی ہوئی پنشن نہیں مل رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اب تک جو کم پنشن دی گئی ہے اس کا پورا حساب کرکے مجھے ادا کیا جائے ۔ تیسرے یہ کہ پوری پنشن میں جو میرا حصہ ہو وہ علیحدہ مجھے ملا کرے ۔ چوتھے یہ کہ میری پنشن فیروز پور سے منتقل ہوکر خزانۂ سرکار میں آجائے اور وہاں سے مجھے ملا کرے تاکہ مجھے فیروز پور سے مانگنی نہ پڑے ۔ پانچواں مطالبہ خطاب اور خلعت کا تھا ۔ان میں سے پہلے دونوں مطالبے نامنظور ہوگئے تھے جبکہ تیسرا اور چوتھا مطالبہ قبول کرلیا گیا تھا ۔ رہا پانچواں مطالبہ تو یہ بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ لہٰذا مرزا غالب کلکتہ میں ڈیڑھ سال سے زائد وقت تک امیدوں کے سہارے قیام پذیر رہنے اور دہلی سے تین برس کی غیر حاضری کے بعد کے بعد 20، 21 اگست 1829ء کو کلکتے سے روانہ ہوکر 29 نومبر 1829ء مطابق یکم جمادی الثانیہ 1245ھ کو دہلی نامراد واپس ہوئے۔

کلکتے کا ماحول اور یہاں کی فضا مرزا غالبؔ کو اتنا بھا گئی اوراس قدر پسند آگئی کہ کلکتہ کی مدح سرائی پر مجبور ہوگئے، مرزا غالبؔ رقم طراز ہیں:

"کلکتے جیسا شہر تختۂ زمین پر نہیں ، یہاں کی خاک نشینی اور جگہ کی حکمرانی سے بہتر ہے۔ خدا کی قسم اگر میں مجرّد ہوتا اور خانہ داری کی ذمّہ داریاں اور زنجیریں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عمر بھر کے لئے یہیں کا ہو رہتا۔"

(مالک رام۔ ذکرِ غالب، ص ۷۳)

مرزا غالب مزید کلکتے کی مدح سرائی فرماتے ہیں: ؎

غالب! ہر پردہ نوائے دارد
ہر گوشۂ از دہر فضائے دارد
برچیدہ بیوست ز دماغم یکسر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد
(کلیات غالب فارسی)

(ترجمہ: زندگی کے ہر پردے میں ایک آہنگ ہوتا ہے۔ زمانے میں ہر گوشے میں ایک فضا ہوتی ہے۔ میرے دماغ کی ساری یبوست (خشکی) چن کر نکال دی۔ بنگالہ کی عجیب آب وہوا ہے۔)

قیامِ کلکتہ کے دوران ایک ادبی معرکہ بھی پیش آیا۔ ہوا یوں کہ جن دونوں مرزا غالبؔ کلکتہ تشریف لائے ، ان ایام میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسہ عالیہ کے زیر اہتمام انگریزی مہینے کے ہر پہلے اتوار کو ایک ادبی محفل اور بزمِ سخن کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ مرزا غالبؔ کے ورودِ کلکتہ کے بعد حسبِ سابق وحسبِ دستور تین مشاعرے منعقد کئے گئے: پہلا مشاعرہ یکم جون 1828ء کو۔ دوسرا مشاعرہ 8 جون 1828ء کو۔ تیسرا مشاعرہ 15 جون 1828ء کو۔

(نامہ ہائے فارسی غالب، ص ۱۵۸)

پہلے مشاعرے میں مرزا غالبؔ کا کلام عوام وخواص دونوں نے بے حد پسند کیا ۔ دوسرا مشاعرے میں مرزا غالبؔ کے اندازے کے مطابق پانچ ہزار کا مجمع تھا، اس مشاعرے میں مرزا غالبؔ کو حکیم ہمام تبریزی کی زمین میں غزل پڑھنے کے لئے ایک مصرع طرح دیا گیا جس کا پہلا شعر (مطلع) یہ ہے ؎

درمیانِ من و دلدار ہمام است حجاب
دارم امید کہ آں ہم زمیاں برخیزد

اسی زمین میں مرزا غالبؔ نے اپنی ایک غزل پڑھی؛ جس کا ایک شعر اور مقطع درج ذیل ہے ؎

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہیچ موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد
گرد ہم شرحِ ستم ہائے عزیزاں غالبؔ
رسمِ امید ہما ناز جہاں برخیزد
(مالک رام ۔ ذکرِ غالب ، ص ۷۵، ۷۶)

حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ مصرعِ اول میں لفظ بیش کے بجائے بیشتر ہونا چاہئے ۔ معاً ایک دوسرا معترض بول اٹھا کہ مصرعِ دوم میں "موئے زمیاں" کی ترکیب غلط ہونے کے سبب پورا شعر ہی غلط اور بے معنی ہے۔ ایک تیسرے صاحب معترض ہوئے کہ "ہمہ عالم" صحیح نہیں ہے کیونکہ عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ حسب اجتہادِ قتیلؔ ممنوع ہے۔

اسی طرح مرزا غالبؔ کی دوسری غزل جو انھوں نے اس مشاعرے میں پڑھی تھی اس کے درج ذیل شعر پر بھی اعتراض ہوا ؎

شورِ اشکے بہ فشارِ بن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروساماںٔ طوفاں زدۂ
(ایضاً ص ۷۶)

اس شعر پر یہ اعتراض کیا گیا کہ مصرعِ ثانی میں لفظ "زدۂ" کا استعمال غلط ہوا ہے۔

مرزا غالبؔ نے قتیلؔ کا نام سن کر نہایت ناگواری کا اظہار کرتے اور ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا قتیلؔ کون؟ وہی فرید آباد کا کھتری بچہ؟ چونکہ مرزا غالبؔ کے نزدیک ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں حضرت امیر خسروؔ کے سوا کوئی اور مسلّم الثبوت شاعر نہیں تھا، اس لئے کہا کہ میں کیوں قتیلؔ کو سند اور دلیل مانوں؟ کلکتہ کے لوگ زیادہ تر قتیلؔ کے شاگرد اور مدّاح تھے، اس لئے اس بات پر ہنگامہ برپا ہو گیا، حالانکہ غالبؔ کے اشعار پر کئے گئے اعتراضات میں فنّی اعتبار سے اور ادبی سطح پر کوئی جان نہیں تھی بلکہ اصل مقصد ان حضرات کا ایسٹ انڈیا کمپنی کی نظر میں غالبؔ کو ذلیل و رسوا اور کم علم ثابت کر دینا، تاکہ پنشن کے معاملات میں غالبؔ پر منفی اثرات مرتّب ہوں۔ لیکن غالبؔ نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ دریا میں رہ مگر مچھ سے بیر کرنا عقلمندی نہیں، اور نہ معلوم مجھے کتنے ایّام یہاں اور ٹھہرنا پڑے، اس لئے ان مصالح کے پیشِ نظر نواب اکبر علی خاں اور مولوی محمد محسن کی فرمائش پر مثنوی "بادِ مخالف" تحریر فرمائی جس میں غالبؔ نے اپنی غریب الوطنی کا تذکرہ اور اہلِ کلکتہ کی مخالفت اور نامہربانیوں کا شکوہ، ان کے اعتراضات اور اپنے جوابات کا ذکرِ بسیط نہایت ہی عمدہ اور دل پذیر پیرائے میں، نیز اپنی صفائی بہت ہی دردانگیز انداز میں بیان فرمایا ہے۔

اسی طرح مثنوی "بادِ مخالف" میں کلکتہ آنے کی غرض و غایت، فارسی زبان میں اپنے مسلک و مذہب اور اصول و ضوابط کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے مرزا غالبؔ فرماتے ہیں:

"خدا گواہ، میں آویزشِ بیان سے نہیں ڈرتا اور نہ مجھے اعتراضات کا خوف و ڈر ہے، چند دنوں کے لئے یہاں آنا ہوا ہے اگر میں نے اہلِ کلکتہ کو ناراض کر لیا تو کہاں جاؤں گا اور آپ حضرات یہ کہیں گے کہ دلی سے ایک شوخ چشم اور بے حیا شخص آیا تھا جو بڑوں سے فضول میں برسرِ پیکار ہو گیا اس طرح میں اپنے وطن کی بدنامی کا باعث بنوں گا، اس لئے میں معذرت خواہ اور درخواست گزار ہوں کہ آپ لوگ ساری باتیں فراموش کر دیں۔"

مرزا غالبؔ کی یہ مثنوی بنام بادِ مخالف محض ایک ادبی شاہکار ہی نہیں ہے بلکہ ایک عظیم شاعر کے ذہنی کرب، دلی تکلیف اور قلبی واردات کا آئینہ ہے جس میں صاحبِ مثنوی نے اپنے رنج و آلام، دکھ اور درد کی جو منظر کشی کی ہے اس کا منبع و مبدأ اس کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات بھی ہیں جن سے مرزا غالبؔ کو کلکتہ میں سابقہ پڑا۔ اور غالب کی یہ تنگ دستی، غریب الوطنی مفلوک الحالی، مفلسی، ناقدری، بے عزتی، رسوائی، ناکامی اور مایوسی ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکی۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

مرزا غالبؔ کو یہ معلوم تھا کہ میرے اشعار پر اعتراضات کرنے والوں اور ادبی معرکہ آرائی میں ایسے حضرات شامل ہیں جن کی مخالفت مجھے پنشن کے معاملے میں ضرور نقصان پہنچائے گی، اس لئے غالبؔ نے مثنوی "بادِ مخالف" میں ان کی نہایت عمدہ انداز اور دلچسپ اسلوب میں مدح سرائی فرمائی ہے۔

اے تماشائیانِ بزمِ سخن
وی مسیحا دمانِ نادرہ فن
اے گراں مایگانِ عالم حرف
خوش نشینانِ ایں بساط شگرف
اے سخن پرورانِ کلکتہ
وی زباں آورانِ کلکتہ
ہر یکے صدر بزم بارگہی
شمعِ خلوت سرائے کارگہی
(حالیؔ۔ یادگارِ غالب، ص 35،34)

(ترجمہ: اے بزمِ شعر کے تماشائیو! اور اے اہلِ کمال لوگو! جو مسیحا کی طرح ہو۔ اے بیان کے دنیا کی گراں قدر شخصیتو! اور اے اعلیٰ مسندوں کو زینت بخشنے والو! اے کلکتہ کے شاعرو! اور اس شہرِ کلکتہ کے زباں آورو! تم میں ہر ایک دربار کی محفل کا صدر نشیں ہے اور کارخانۂ علم و ہنر کی خلوت کی روشنی ہے)

اس کے بعد غالبؔ نے اپنا دکھ اور درد بیان کیا ہے کہ میں تمھارا بن بلایا مہمان ہوں اور تمھارے دسترخوان کا خوشہ چیں ہوں۔

خلاصہ یہ کہ مرزا غالبؔ اوّلاً جب کلکتہ پہنچے تو انھیں کلکتہ کی آب و ہوا، وہاں کی فضا اور خوشگوار ماحول انھیں حد درجہ بھا گیا اور دل سے پسند آ گیا حتی کہ تعریف کرنے سے بھی گریز نہیں کیا اور اپنی زندگی کے بقیہ ایام کلکتہ ہی میں بسر کرنے کا عندیہ ظاہر کرنے میں بھی کوئی شرم اور جھجھک محسوس نہیں کی۔ لیکن جب ان کی مخالفت کی گئی تو مثنوی "بادِ مخالف" لکھ کر اہلِ کلکتہ کا شکوہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ یوں مرزا غالبؔ کلکتہ میں تقریباً ڈیڑھ سال گزارنے کے بعد دہلی واپس ہوئے، اور یوں مرزا غالب کا سفرِ کلکتہ مکمل ہوا۔ ☆☆☆

خراجِ عقیدت

اچھا شاعر و شریف انسان: رباب رشیدی

احمد ابراہیم علوی

(سابق ایڈیٹر، روزنامہ آگ، لکھنؤ)

رباب رشیدی کا پہلا شعری مجموعہ "ابرِ سفید" ۱۹۸۵ میں شائع ہوا تو انھوں نے ازراہِ عنایت مجھے ایک جلد دی اور کہا کہ کچھ لکھئے گا۔ میری ان سے کم از کم ۱۰ برس سے ملاقات نہیں بلکہ دوستی تھی، اس لیے میں نے اظہارِ مسرت کیا اور مجموعہ پڑھا، پھر اس پر مضمون لکھ دیا۔ پاکستان کے ایک رسالہ نے مجھ سے کوئی تخلیق بھیجنے کو بہت پہلے کہا تھا۔ چونکہ وہ رسالہ کافی مقبول اور معیاری تھا۔ شاید "قومی زبان" نام تھا۔ میں نے اسی رسالہ کو مضمون بھیج دیا اور مطمئن ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب کی شکایت آئی کہ آپ سے بہت پہلے رسالہ کے لیے کچھ لکھنے کو کہا تھا۔ آپ نے وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر اب تک انتظار ہی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مضمون محکمۂ ڈاک کی نذر ہو گیا۔ میں اپنے مضامین کی نقل نہیں رکھتا جیسے لکھتا ہوں ویسے بھیج دیتا ہوں، اس لیے تحریر ڈاک کی نذر ہو جاتی ہے اور بعد میں افسوس ہوتا ہے۔

میں نے رباب رشیدی سے معذرت کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ آئندہ جب کبھی آپ کی کتاب آئے گی تو ضرور لکھوں گا اور آپ کو ہی تحریر دوں گا لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکا۔ پھر جو کتابیں آئیں ان پر میں نے کچھ نہ کچھ لکھ کر اپنے روزنامہ "آگ" میں شائع کر دیا۔ اس کا ہمیشہ اچھا اثر ہوا۔

رباب رشیدی کے انتقال سے مجھے کچھ زیادہ ہی رنج ہوا۔ وہ ایک اچھے، مخلص اور پاسِ وفا سے معمور انسان تھے، نرم رو، صاف دل دماغ رکھنے والے باکمال شاعر تھے۔ مستقل کچھ نہ کچھ کہتے اور لکھتے رہتے تھے۔ تعلقات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔

رباب صاحب کی والدہ کا انتقال اس وقت ہوا تھا جبکہ ان کی عمر بہت کم تھی۔ ان کی پھوپھی، خالہ اور قریبی رشتہ دار لکھنؤ میں رہتے تھے۔ والد کو بھی برابر لکھنؤ آنا ہوتا تھا۔ وہ رباب صاحب کو بھی اپنے ہمراہ لے آتے تھے۔ خالہ نے ماں بن کر رباب رشیدی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ بچے بھی بے پناہ محبت کرتے تھے۔ رباب صاحب کو اور چاہیے بھی کیا تھا۔ انھیں شفقت و عزت ملی۔ گھر سے باہر شاہجہاں پور سے بہتر ماحول ملا۔ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں سے ملنے کے مواقع ملے۔ یعنی وہ سب کچھ مل گیا جو کہ باقاعدہ اسکول و کالج کی تعلیم سے بھی ملنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسے نکھر کر سامنے آئے کہ ہر جگہ عزت ملی۔ ریڈیو اور ٹی وی پر مواقع ملنے لگے۔

رباب صاحب نے بڑے مشاعروں میں شرکت سے زیادہ معیاری رسائل میں کلام شائع کرا کے خود کو مسرور و مطمئن رکھا۔ ماہنامہ "نیا دو" معیاری اور پرکشش رسالہ تھا، اس میں ہر مہینے ہی رباب رشیدی کی کوئی نہ کوئی تحریر شائع ہوتی تھی۔ اس سے وہ اِدھر اُدھر کی بھاگ دوڑ کی مشقت اور جوڑ توڑ کی سیاست سے بچے رہے۔ وقار برقرار رہا اور ادبی تسکین کا ساماں بھی پیہم رہا۔

رباب رشیدی نے غزلیں لکھیں تو نظم و قطعات و رباعیات میں بھی اپنی فنکاری کے جوہر دکھائے۔ سنجیدگی، متانت، خلوص اور سلیقے سے بات کہنے کے ہنر کی وجہ سے رباب رشیدی کا کلام ہمیشہ ہر جگہ پسند کیا گیا۔ آخر میں انھوں نے مذہب کو ایک طرح اوڑھ لیا۔ داڑھی رکھ لی، حج کیا، عمرہ کیا اور پنج وقتہ نماز کا اہتمام کیا۔ تہجد گذار بھی ہو گئے۔ اس لیے زیادہ توجہ نعت گوئی کی طرف کی۔ نعتوں کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے۔

بقیہ ص ۳۵ پر

خراجِ عقیدت

رباب رشیدی: بہت سے راز چھپائے رہے وہ دل میں ہی

رضوان احمد فارقی

(لکھنؤ۔موبائل: 8948594072)

رباب رشیدی (۲۰۲۲-۱۹۴۰) کی شاعری میں پرت در پرت احساسات کے جگنوؤں کا رقص ہے۔ سادہ تمنائیں، معصوم جذبے اور شگفتہ خیالات کی کہکشاں بکھری ہوئی ہے۔ یادوں کی رہ گذر سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو ہے۔ بچپن کے ماہ وسال اور سہانی رُتیں ہیں۔ گلابی آنکھوں کے احساس کے لمس سے ان کا وجود مہک اٹھتا مگر اِس احساس کی مشتہری سے ان پر خوف طاری ہو جاتا۔ نتیجتاً اپنے جذبوں کو الفاظ کے پردے میں چھپائے رہے۔ گمنامی کو مقدر بنالیا۔ نہ شادی کی، نہ اظہار محبت، نہ کسی کی بیوفائی کا اعلان، نہ رسوا ہوئے نہ کسی کو رسوا کیا مگر "ابر سفید" نے سب کچھ بیان کر دیا۔ تاڑنے والوں سے کچھ بھی نہیں چھپ سکا۔ ادبی چوپالوں میں گفتگو اور احباب میں "چہ می گوئیاں" ہوئیں۔ مگر رباب صاحب نہ کھلے۔ انھوں نے نہ صرف رشتہ کی پاکیزگی کو برقرار رکھا بلکہ تقدس کے تاروں کو ٹوٹنے یا بکھرنے نہیں دیا۔----- پھر کسی دوسرے کو کب حق ہے کہ وہ راز کو فاش کرے اور فسانے کو حقیقت کا روپ دے کر دنیا کو وہ کچھ بتائے جو کہ تضحیک یا تکلیف کا باعث ہو۔

ہمیں تو شاعر کے نرم وگداز احساس، اس کی تازہ کاری، شگفتہ کلامی اور زندگی کے اچھے پہلوؤں سے مطلب ہے۔ اس طرح شاعر کے نہ رہنے پر بھی اُسے اپنے دل ودماغ میں محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ شاعر اپنے ماضی میں جھانکتا ہے تو بچپن کی یادیں، جوانی کی شوخیاں، گلی کوچے، بازار، کھیت کھلیان، گھر کے در ودیوار اور نہ جانے کیا کچھ یاد آتا ہے۔ پھر وہ کیوں نہ کہے ؎

لہجے تھے کہ شوخی کی قسم کھاتے تھے
احباب سبھی منچلے کہلاتے تھے
ایسا بھی کبھی ہوتا تھا باتیں
کرتے بستی سے بہت دور چلے جاتے تھے

اسی قبیل کی دوسری رباعی سے ملاقات کیجئے:

دریا میں نہانے کا وہ رنگیں منظر
بارش میں وہ سڑکوں پہ نکلنا اکثر
جذبات میں سیلاب، خیالوں میں سرور
اور جوش وہ جذبوں میں کہ ساغر ساغر

شاعر کے اولین مجموعہ "ابر سفید" سے دور باعیات میں نے پیش کیں۔ ۲۶۰/صفحات کا یہ مجموعہ مختلف اصناف کا گلدستہ ہے جو ۱۹۸۵ء میں نامی پریس لکھنؤ

سے چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔ مجموعہ کی کتابت مشہور خوشنویس محمد الیاس نے کی ہے۔ یہ مجموعہ نعتوں، غزلوں اور رباعیات سے آراستہ ہے۔ مگر رواجِ زمانہ کے مطابق شاعر نے کسی بڑے قلم کار سے اپنے متعلق کچھ بھی نہیں لکھوایا ہے جو ثبوت ہے اس بات کا کہ شاعر اپنے کلام، صلاحیتوں اور فن سے اس قدر مطمئن تھا کہ اس نے خود کو متعارف کرانے کے لیے کسی بیساکھی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ شاعر کی یہی ادا مجھے بھا گئی اور میں نے ۲۰۰۸ء میں تحریر کردہ اپنے طویل مضمون "لکھنو: کچھ ماضی، کچھ حال" جو روزنامہ "آگ" میں نمایاں طور پر شائع ہوا اور بعد میں ۲۰۱۲ء میں کتابی شکل میں آیا۔ شاعر محترم کا ان الفاظ میں ذکر ہے:

"رباب صاحب کی زندگی اور شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کی تصانیف "ابر سفید" اور "الف میم" کو پڑھنا ہوگا۔ آپ کے مشہور ناقد رشید حسن خاں سے بہت قریبی تعلقات رہے (ان کے استاد بھی اسی نام کے شاعر ہیں)۔ آپ کا وطن مولود شاہجہانپور ہے مگر عمر کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزارا۔ کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور دوسروں کو بنانے سنوارنے کا انھیں فن آتا ہے۔ شاگردوں کی طویل فہرست ہے۔ لکھنؤ میں جو ان سے مشورۂ سخن کرتے ہیں ان میں ظفر شہیدی، رحمت لکھنوی، حامد اللہ قمر لکھنوی، راز بھارتی اور قاری اشرف قریشی میرے علم میں ہیں۔ ان کی شخصیت، فن اور شاعری پر ڈاکٹر تابش مہدی صاحب نے حال ہی میں اک کتاب "رباب رشیدی: ایک سخنور پیارا سا" شائع کی ہے۔ رباب شناسی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان کا مشہور شعر ہے ؎

اپنی خوش ذوقی پہ اک الزام ہو کر رہ گئے
نام والے تھے برائے نام ہو کر رہ گئے"

زندگی کے آخری چند برسوں میں مشاعروں کے کامیاب شاعر سلیم تابش ان سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے ظفر شہیدی (مرحوم) بھی ان ہی کے دامن سے وابستہ تھے اور شاہجہانپور کے رونق مصور عارفی پختہ کار و استاد شاعر ہونے کے باوجود رباب صاحب کو فخریہ طور پر استاد تسلیم کرتے تھے۔ اپنے شعری مجموعے "بازیافت" میں انھوں نے رباب صاحب کا ذکر سعید کیا ہے۔ جب کہ اس کتاب میں قرۃ العین جیسی اہم ادیبہ کا مضمون بھی شامل ہے۔

بلا مبالغہ رونق مصور عارفی اور ظفر شہیدی جیسے شعراء کی شاگردی پر ناز و فخر کیا جا سکتا ہے مگر رباب صاحب کی گردن میں خم رہا۔ وہ اترا کر چلنے یا متکبرانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے منکسر المزاج اور نرم خو رہے۔ غوث آباد (سلطانپور) کے شاہ نسیم الدین قادری بھی ان کی قدر و منزلت کو سمجھتے رہے اور لکھنؤ کے مولانا آغا روحی بھی! طاہر تلہری بھی ان سے وابستہ تھے اور شفیق طاہری بھی۔ دونوں کو آل انڈیا میر اکادمی سے رباب صاحب کی وجہ سے نوازا گیا۔ نہ جانے کتنے گمنام شاعر و ادیب ہیں جن کی تخلیقات کو معیاری رسائل میں چھپوا کر انھوں نے متعارف کرایا۔ ریڈیو، ٹی وی تک پہنچا کر مالی فائدہ بھی پہونچایا۔ اور یہ سارے کام تب کئے جب کہ وہ بالکل دنیا دار لگتے تھے۔ خوش لباسی اور وضعداری تب بھی قابل دید تھی مگر ایسے خدا رسیدہ نہ تھے جیسا کہ بعد میں ہو گئے تھے۔

رباب صاحب شاعر ابن شاعر تھے۔ والد کا نام حکیم غلام جیلانی اور تخلص اسیرؔ تھا۔ اوائل عمری میں والدین کا یکے بعد دیگرے گذر جانا، خاندان کے دوسرے افراد کا رخت سفر باندھنا، شاعر کے دلِ حساس کو مضطرب کرتا ہے تو نوکِ قلم پر یہ رباعی رقص کرنے لگتی ہے، جس کے قوافی رنجیدہ، نمدیدہ اور سنجیدہ ہیں ؎

احساس کو رنجیدہ بنانے والے
ماحول کو نمدیدہ بنانے والے
کچھ حسرتیں بے قرار رکھنے والی
کچھ سانحے سنجیدہ بنانے والے

موروثی شاعر ہونے کے سبب شاعر کو حق ہے کہ وہ کہے ؎

ورثے میں ملا ہم کو مذاق شعری
اور ساتھ روایتوں کی دولت پائی
چکا گئی، مہکا گئی، ذہن و دل کو
علمی ادبی فضا ہمارے گھر کی

عموماً شعراء غزل سے آغاز کرتے ہیں لیکن ربابؔ صاحب نے ابتداء میں رباعیات رقم کیں۔ بعد میں وہ غزل اور دوسری اصناف کی طرف متوجہ ہوئے۔ شروع میں ان کی کم سخنی اور شرمیلے پن کے باعث احباب کو بھی ان کے شاعر ہونے کا احساس نہ ہوا۔ کیونکہ شاعر کی صفت خاص ہے کہ ادھر غزل ہوئی اُدھر پیٹ میں مروڑ شروع ہوئی اور جب تک ادبی چوپالوں یا بے تکلف احباب میں وہ غزل نہ سنالے تب تک عجیب سی بے کیفی رہتی ہے۔ رباب صاحب ذرا مختلف تھے۔ خود ہی فرماتے ہیں ؎

اک عمر غزل خوانی سے ہم دور رہے
خود شعر کہے، خود سنے، مسرور رہے
جو لوگ تھے نزدیک وہی جانتے تھے
اس باب میں خاصے غیر مشہور رہے

عمر کے ساتھ جو تغیر و تبدل واقع ہوا، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

پھر سلسلۂ فکر بڑھانا ہی پڑا
دنیا کے ضابطے میں آنا ہی پڑا
یاروں کے سبب شعر سنانے ہی پڑے
آخر ہمیں محفلوں میں جانا ہی پڑا

ارباب سخن فہم سے عزت بھی ملی
آئے گئے جا بجا تو شہرت بھی ملی
تسلیم ہمیں کرنے لگے شہر کے لوگ
شفقت بھی ملی اور محبت بھی ملی

غالباً یہ باتیں ہیں والدین کی حیات کی، جب مسائل حیات اور مصائب دنیا سے کچھ خاص تعلق نہ تھا، خوشحالی اور بے فکری تھی، لیکن والدین کے وصال کے بعد حالات کی تمازت اور مسائل کے تھپیڑوں نے انھیں لکھنؤ کا رخ کرنے پر مجبور کیا۔ تب وہ یوں گویا ہوئے۔

نیرنگیِ حالات نے پلٹا کھایا
ماحول طبیعت میں تغیر لایا
ہر دور بدلنے کے لیے آتا ہے
جب دوپہر آئی تو سمجھ میں آیا

حقیقت کا برملا اظہار ہو تو جرات و جسارت کے موتی از خود ہاتھ آجاتے ہیں۔ ممکن ہے لہجہ میں تلخی آجائے مگر تاثیر شعر میں اضافہ ہو جاتا ہے جیسے۔

بڑی ہی سخت سزا تھی ہماری مجبوری
کہ ایک عمر گزار آئے بے ضمیروں میں

تجربات زمانہ نے یہ شعر بھی کہنے پر مجبور کیا۔

نظریں بچا بچا کے گزرنے لگے ہیں لوگ
میں خوش ہوں کامیاب رہا میرا تجربہ

کچھ شعر اچھے ہو کر بھی ان کی تشریح مشکل ہوتی ہے۔ ایک ایسا ہی شعر حاضر ہے۔

تجھ سے دوری کسی مجذوب کی منفی باتیں
تیرا ملنا کسی سالک کی دعا ہو جیسے

شاعر کا یہ شعر کیوں نہ لکھا جائے۔

سوائے کج کلہی اور اب رہا کیا ہے
یہی ہے دولت اسلاف ہم فقیروں میں

شاعر کی تمنائے دل بھی ملاحظہ فرمائیں۔

پڑھتا رہوں حضور یہ دن رات میں درود
کچھ اختیار دے تو یہی اختیار دے

شاعر کا یہ خیال بھی درست ہے کہ ارباب تجسس کے وہم کا علاج سحرِ سامری میں نہیں بلکہ طبیبہ کے نظاروں اور وہاں کی فضا میں ہے۔ نیز عنایاتِ نبوی کا امیدوار، حالات کی دھوپ اور مسائل کی تمازت سے کبھی خائف نہیں ہوتا۔ شاعر اپنے رب کے حضور سلیقۂ عرض تمنا کی دعا کرتا ہے تو اسے عقل و خرد کے موتیوں سے نوازا جاتا ہے۔

جسے میں اپنا کہوں اور جہاں سکوں سے رہوں
مرے خدا مجھے اک ایسا گھر عطا کردے

امید ہے شاعر کا مذکورہ شعر بارگاہِ رب العزت میں قبول ہو کر اس کی قبر کی منزل کو آساں کردے گا۔

رباب رشیدی اور نیا دور:

تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ جس اہتمام اور تسلسل سے رباب صاحب لکھنؤ کے ماہنامہ "نیا دور" میں نظر آئے۔ اگر اس طرح دیگر مؤقر جرائد و رسائل میں بھی شائع ہوتے تو لکھنؤ اور شاہجہانپور کے سب سے محبوب نہ سہی مگر مقبول شاعر ضرور ہوتے۔ لیکن انھوں نے باوفا عاشق کی طرح خود کو ایک ہی در تک محدود رکھا۔ سچ تو یہ ہے بھی کہ "نیا دور" میں ابتدائی صفحات میں جس طرح ان کی ہر چھوٹی بڑی تحریر کو جگہ دی گئی، اس طرح ان سے کجا اہم قلمکاروں کو جگہ نہیں ملی۔ شاید اس کی وجہ ان کی بے لوث قربانیاں تھیں۔ تقریباً ہر روز صبح اٹھ کر انفارمیشن دفتر جانا آنا ان کا معمول تھا۔ لیکن خود کو چھپانا اور فائدے اٹھانا ہی ان کا مشن نہ تھا۔ "نیا دور" سے طویل مدت تک بحیثیت مدیر وابستہ رہے امیر احمد صدیقی سے مرحوم کے قریبی مراسم تھے۔ پھر امجد صاحب سے بھی انھوں نے خوب کام لیا۔ اس دور میں اہم نمبر نکلے اور شعراء و ادباء کے اعزازیہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ امجد صاحب نے بغیر کسی تفریق کے کام کیا۔ وضاحت حسین رضوی کا دور بھی غنیمت ہے اور اہم نمبروں کی اشاعت کے حوالہ سے یاد رکھا جائے گا۔

رباب صاحب نے خفیہ طور پر "نیا دور" کو سجایا سنوارا مگر اپنا نام کبھی کہیں کسی حیثیت سے آنے نہ دیا۔ جب کہ ان کے بہت بعد والے، کافی جونیر لوگ "نیا دور" سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ ہوئے اور ایڈیٹر کے ہمراہ مختلف حیثیتوں سے ان کے نام بھی مختصر اور اور کبھی طویل مدت تک نظر آئے۔

کم لوگ جانتے ہیں کہ رباب صاحب نے "اربابِ فکر فورم" نام کی ایک ادبی تنظیم قائم کر رکھی تھی۔ جس کا مقصد روایتی پروگرام کرنا، شعراء کو ہر ماہ دعوت شعر دینا، یا محض غزل خوانی کی محفلیں آراستہ کرنا ہی نہ تھا بلکہ سال میں کم

ازکم ایک مرتبہ کسی نہ کسی عنوان سے میگزین جاری کرنا تھا۔ جس میں نہ صرف مخصوص اشخاص کی تخلیقات یکجا ہوتیں بلکہ میگزین کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ان میگزینوں میں اردو اکادمی سے لے کر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش کے اشتہارات شامل رہتے۔ یعنی رباب صاحب نے ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے پیٹ کی ضرورت کو پس پشت نہیں ڈالا۔ گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کیا۔ غریب پروری اور دست نوازی کے ساتھ جن کے کشکول اپنی فکر کے چاول سے بھرے، ان میں باریش بھی تھے، ٹائی والے بھی اور اعلیٰ افسران بھی! ایسے اشخاص وافراد اپنی ضرورتوں کی تکمیل اور معاملات کو راز رکھنے کے لیے جیب خالی کرتے اور رباب صاحب بے دریغ قلم کی سیاہی صرف کرتے۔ مگر اس روش نے کہیں نہ کہیں انھیں نقصان پہنچایا۔ بہت سے اچھے اشعار جو ان کا چہرہ بن سکتے تھے، مقبولیت اور محبوبیت دلا سکتے تھے وہ بھی ضائع ہو گئے۔ نثر اچھی لکھتے تھے مگر باقاعدگی سے کام کرنے کے بجائے ضرورتاً ہی لکھی یا دوسروں کے لیے لکھی، سرکاری مضامین لکھے جن پر گفتگو محال ہے۔ مشاعروں کی ضرورت بھی پوری نہ کر سکے۔ ہاں مشاعرہ باز شاعر ضرور تیار کیے۔ جن میں سے بیشتر اتنی اہلیت بھی نہیں رکھتے کہ استاد کے نہ رہنے پر چند لفظوں میں اظہار عقیدت و محبت ہی کر سکیں۔

مخصوص شعری نشستوں میں انھیں کبھی کبھار ان آنکھوں نے بھی دیکھا ہے۔ جیسے بزمِ شعراء کی نشستیں یا موجودہ دور میں راز بھارتی صاحب کی قائم کردہ "بزم نور" میں وہ اپنے مزاج اور منشا کے مطابق آتے، خوب لطف اندوز ہوتے، اپنا کلام سناتے اور ہر چھوٹے بڑے کو سنتے، روایتی شاعری پر خصوصی داد دیتے۔ نعت کے اشعار سن کر روتے بھی، وارفتگی شوق میں جھوم جھوم کر داد دیتے۔ بزم نور کے رجسٹر سے ان کا کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی مل سکتا ہے جو یوٹیوب چینل "لرن آن لائن ودھ فیضان خان" پر دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔ اسی حوالہ سے ان کی نظم "حجۃ الوداع" خاصی مشہور ہوئی۔

بزم نور کی ہی آخری نشست میں انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

کسی حسیں نہ کسی خوبرو کے مارے ہیں
جو سچ بتائیں تو ہم لکھنؤ کے مارے ہیں

اچھی بات یہ ہے کہ انھوں نے مقصد وجود کو سمجھ لیا تھا۔ آخری چند برسوں میں وہ متشرع ہو گئے تھے۔ خوف خدا ایسا غالب آ گیا تھا کہ دل مسجد میں لگا رہتا تھا۔ اب وہ افسران کو چھوڑ چھاڑ کر خدا رسیدہ اور پاکباز افراد سے قریب ہو گئے تھے۔ پہلے بریلویت، پھر خانقاہیت اور بعد کے برسوں میں علمائے ندوہ کے قریب ہو گئے تھے۔ گذشتہ کئی برسوں سے پیہم عمرے کر رہے تھے۔ سعادت حج سے بہرہ ور تھے اور انتقال سے ڈیڑھ ماہ قبل مقامات مقدسہ کی زیارت کر کے واپس آئے تھے، کہ وقتِ موعود آ گیا تھا۔ ۱۰/ جنوری ۱۹۴۰ کو دنیائے آب وگل میں قدم رکھنے والے اس فنکار نے بیاسی سال کی عمر میں ۶/ اکتوبر ۲۰۲۲ بروز جمعرات آخری سانس لی اور عیش باغ قبرستان لکھنؤ میں ہزاروں سوگواروں کے بیچ سپردِ خاک کیے گئے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆

نمونۂ کلام

غزل

رباب رشیدی

کوئی بھی عقدہ کشائے خود آگہی نہ ملا
میں اپنے آپ سے بھی آج تک کبھی نہ ملا

مشاہدات پہ قدرت نہ تجربات پہ ناز
ہمیں تو کوئی ہنر تجھ سے زندگی نہ ملا

شعور راہبری راہ دیکھتا کب تک
اس آدمی کی جسے ذوق رہروی نہ ملا

دیار شوق میں سب کچھ مجھے نظر آیا
مگر گیا تھا میں جس کے لئے وہی نہ ملا

بتائیں کیا تمہیں اس قافلے کے بارے میں
کہ ہم کو راہ میں جس کا غبار بھی نہ ملا

رباب اپنے ہی چہرے پہ جم گئیں نظریں
جب آئنوں میں کوئی اور عکس ہی نہ ملا

☆☆☆

وہ اور ہیں جنہیں احساس تیرگی ہے بہت
یہاں تو ٹوٹتے لمحوں کی روشنی ہے بہت

ہمیں بھی کر دیا شامل انہیں میں لوگوں نے
کہ جن کی فکر و نظر میں شکستگی ہے بہت

کہاں چلے گئے جاں داد گان شوق و وفا
ہمارے ہوتے ہوئے بھی یہاں کمی ہے بہت

وہ اک خلش جو تری یاد سے قریب بھی ہے
تمام عمر کو میرے لئے وہی ہے بہت

ذرا سی دیر ہی مل کر بچھڑنے والوں کو
خیال ذات ہے کم پاس تشنگی ہے بہت

تجھے خبر بھی ہے راتوں کو جاگنے والے
مزاج میری بھی آنکھوں کا شبنمی ہے بہت

☆☆☆

خراجِ عقیدت

پروفیسر اصغر عباس: ایک اور ستارہ غروب ہوا

ڈاکٹر غلام حسین

(صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ مادھو کالج، اُجین (ایم پی) موبائل:9893853183)

اردو کی مقتدر اور مقبول ہستیاں اس جہان آب وگل سے رخصت ہوتی جارہی ہیں۔ابھی 7 ستمبر ہی کی تو بات ہے کہ پروفیسر اصغر عباس کی رحلت سے دل پاش پاش ہوگیا۔آپ کا شمار نامی گرامی اساتذہ، محققین و مدبرین میں ہوتا تھا۔آپ نے مطالعۂ سرسید میں پوری عمر گزار دی۔نتیجتاً ماہرین سرسیدیات میں آپ کا نام شمار ہونے لگا۔ان کے اس کارنامے کی وجہ سے کسی مدبر نے بجا فرمایا ہے کہ ''اگر پروفیسر اصغر عباس سرسید کے ہم عصروں میں ہوتے تو ان کا شمار رفقائے سرسید میں ہوتا۔''

اصغر عباس کی اعلیٰ تعلیم گورکھپور یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی میں ہوئی۔وہ اتنے ذہین، مہذب اور حلیم الطبع شاگرد تھے کہ دونوں یونیورسٹیوں کے سربراہان پروفیسر محمود الٰہی اور پروفیسر آل احمد سرور کی خصوصی نظران پر تھی۔وہ استاذ اور شاگرد کی مقدس روایت کے پاسدار بھی تھے اور ہر دلعزیز استاذ بھی تھے۔آپ کی رحلت سے اردو دنیا مغموم و افسردہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو دنیا اپنے ایک مخلص خادم سے محروم ہوگئی۔گورکھپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے آپ کا گہرا رشتہ تاحین حیات قائم رہا۔موجودہ سربراہ پروفیسر رضی الرحمن آپ کے بڑے مداح ہیں۔انھوں نے پروفیسر اصغر عباس کے سانحہ ارتحال پر شعبۂ اردو میں ان کے شایان شان تعزیتی جلسہ کا انعقاد کیا اور ملک کے دیگر حصوں سے آپ کے متعلقین کو آن لائن شامل کیا۔انھوں نے تعزیتی جلسہ میں جس انداز سے رنج وغم کا اظہار کیا اس سے ان کی انسیت اور یاسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر اصغر عباس صاحب سے ہمارا رشتہ پیر بھائی کا تھا، مجھ پر بے پناہ شفقت فرماتے اور نیک دعاؤں سے نوازتے۔آپ کے اہل خانہ گورکھپور میں مقیم تھے، اس لیے اکثر و بیشتر گورکھپور آنا جانا لگا رہتا۔جب بھی وہ گورکھپور آتے تو اپنے استاذ محترم پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی خدمت میں لازماً حاضر ہوتے۔ایک شفیق استاذ اور فرمانبردار شاگرد میں طویل اور دلچسپ گفتگو ہوتی جسے دیگر شاگرد خاموشی سے بس سنتے اور اپنی اردو درست کرتے۔منکسر المزاج اصغر عباس طلبہ سے بڑے تپاک سے ملتے اور انھیں نیک مشوروں سے نوازتے۔اس لیے طلبہ بھی ان سے ٹوٹ کر ملتے۔اکثر یونیورسٹی کے کام سے شعبہ میں آپ کی تشریف آوری ہوتی رہتی، اس لیے طلبہ کو ان سے گفت وشنید کا بار بار قیمتی موقع ہاتھ لگتا رہتا۔راقم کے پی ایچ۔ڈی کے ممتحنین میں ایک نام پروفیسر اصغر عباس کا بھی تھا۔ان نے جس انداز سے مناقشے میں مجھے کمفرٹ فیل کرایا، اس سے میں اپنی ساری پریشانیوں کو بھول چکا تھا اور نتیجے میں سارے مراحل بحسن وخوبی انجام پاگیے۔ان کی اس محبت اور اپنائیت کی خوشبو سے بے حد متاثر ہوا۔ایک بار عید کے موقع پر آپ استاذ محترم کو مبارکبادی دینے آئے تو میں بھی اتفاقاً وہاں موجود تھا۔اس وقت انھوں نے جس شائستہ انداز میں معانقہ کیا، اس شفقت کی حرارت کو آج بھی محسوس کررہا ہوں۔وہ سرسید کے کردار وعمل کے شیدا تھے اور ان کے پیغام کو عام کرنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ایک بار انھوں نے اونچوا محلہ میں ایک نشست کا اہتمام کیا۔اس میں بچے بھی شریک ہوئے۔اس نشست میں کھانے پینے کے آداب اور گفتگو کے سلیقے پر جس خاص انداز میں دھیان دیا گیا جو کہ سرسید کی مشن کا ایک حصہ تھا، وہ انتہائی اہم تھا۔یہ اپنے انداز کا ایک انوکھا اور نتیجہ خیز پروگرام تھا۔اس پروگرام میں خاص طور پر آپ کی سادگی اور خلوص دیکھنے لائق تھی۔

ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں بے روزگار تھا۔ڈاکٹر صاحب میرے لیے بڑے متفکر تھے اور مجھے باروزگار دیکھنا چاہتے تھے ۔انھیں دنوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اردو کی کچھ اسامیوں کی خبر مشتہر ہوئی۔ مجھے اشتہار سے متعلق کوئی علم نہیں تھا لیکن ازراہ کرم آپ نے بذریعہ رجسٹری مجھے فارم بھجوایا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اور آپ کا ممنون ہوا۔ فارم بھر دیا، انٹرویو بھی ہوا مگر فیصلہ میرے حق میں نہیں آیا۔ بے دلی تو ہوئی لیکن ڈاکٹر صاحب کی بندہ پروری کو میں کبھی نہیں فراموش کر سکا۔ نہ صرف میں بلکہ ان کی شفقت اور مخلصانہ رویے کا ہر وہ شخص گرویدہ ہے جو کبھی آپ کے رابطے میں آیا۔ میرا تو ذاتی تجربہ ہے سنہ 2000 کی بات ہے، بسلسلہ ریفریشر کورس علی گڑھ یونیورسٹی حاضر ہوا، اس وقت آپ صدر شعبہ تھے اور ریفریشر کورس کے کنوینر پروفیسر سید محمد ہاشم صاحب تھے۔آپ ادبی وتحقیقی مجلہ ''سہ ماہی فکر ونظر'' کے مدیر ہیں اور اردو مرکز نیویارک کی جانب سے شائع ہونے والے عالمی ادبی جریدے سہ ماہی ''ورثہ'' کے سرپرست اعلیٰ ہیں۔ایک گفتگو کے دوران موصوف نے امروہہ کی ایک دلچسپ وجہ تسمیہ بتایا تھا کہ ''آم اور روہو مچھلی دونوں وہاں کی مشہور ہیں، اس لیے اس شہر کو امروہہ کہا گیا''۔۔۔۔۔۔۔خیر، اس ریفریشر کورس میں چوٹی کے اساتذۂ کرام تشریف لائے تھے ۔جن میں دلی سے پروفیسر تنویر احمد علوی، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر عبد الحق، پروفیسر عتیق اللہ، حیدرآباد سے پروفیسر یوسف سرمست ، بنارس سے پروفیسر حنیف نقوی اور علی گڑھ سے پروفیسر نور الحسن نقوی، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر افضال حسین، پروفیسر صغیر افراہیم وغیرہم نے کورس ورک کو بامعنی بنا دیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے بھی مذکورہ اساتذہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوگیا۔وہیں کے ایک جید عالم نے ریفریشر کورس کے شرکاء کو مدعو کیا۔ بعد میں پتا چلا کہ محترم نے انھیں لوگوں کو بلایا تھا جس کا تعلق بہار سے تھا۔اس پر پروفیسر اصغر عباس صاحب نے بلاتفریق سبھی شرکاء کو اپنے دولت خانہ پر مدعو کیا ۔بہت شاندار خورد ونوش کا انتظام کیا اور جی بھر کر سب سے گفتگو کی ۔کئی بصیرت افروز واقعات ،تعلیم وتعلم اور استاد و شاگرد کے متعلق بیان کیے ۔قول وفعل سے متعلق ایک سبق آموز راجستھانی واقعہ بھی دلنشیں انداز میں بیان کیا جو آج بھی ذہن کے پردے پر گردش کر رہا ہے۔واقعہ یوں ہے کہ'' دو مسافر پلیٹ فارم پر کھڑے تھے ۔ضرورتاً ایک مسافر اپنے کام سے جاتے وقت بولا کہ میں ابھی آتا ہوں اور وہ چلا گیا لیکن جس گاڑی کو پکڑنی تھی وہ بھی آئی اور چلی گئی مگر حسب وعدہ وہ منتظر اپنے مسافر ساتھی کا انتظار کرتا رہا ۔کام سے فراغت کے بعد آکر دیکھا کہ وہ آدمی وہیں کھڑا ہے اور گاڑی چلی گئی ۔یہ دیکھ کر وہ ناراض ہوئے کہ آپ کیوں نہیں گئے تو اس نے جواب دیا کہ آپ سے جو وعدہ کیا تھا ۔تو ایسے ہوتے ہیں راجستھانی اپنے وعدے کے پکے ۔'' اس طرح کے واقعات سے وہ محفل کو زعفران زار بنائے رکھتے اور اس ہنر میں وہ کافی ماہر بھی تھے۔

ریفریشر کورس سے واپسی کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ٹیلی فون پر بھی باتیں ہوتی رہتیں ۔کبھی جب کسی مسئلے میں الجھتا تو وہ ایسے نیک مشورے دیتے کہ یک گونہ تشفی ہو جاتی ۔وہ اردو کے غمخوار اور سرسید کے پیروکار تھے۔ان کے پیغامات کو عام کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہتے ۔وہ جلب منفعت و انعام و اکرام سے بہت دور رہتے۔ زیادہ تام جھام اور اشتہار کے قائل نہیں تھے۔ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی وہ مطالعہ میں منہمک رہتے اور تصنیف وتالیف کے عمل میں سرگرم رہے۔ان کی انھیں خدمات کے سبب اترپردیش اردو اکیڈمی کا سب سے بڑا انعام 2020 میں دیا گیا۔گوشہ نشینی کی وجہ سے انھیں بہت کم لوگ جانتے تھے، اس لیے آپ کو جب یہ انعام ملا تو سب چونک گئے ۔بہرحال اکیڈمی کے ارباب حل وعقد کا کمال تھا کہ ڈاکٹر صاحب جیسے گوشہ نشین کو کھوج نکالا اور انھیں اعزاز دے کر ان کی عزت افزائی کی ۔بے شک تصنیف وتالیف اور تنقید وتحقیق میں آپ کی خدمات وقیع ہیں ۔ڈاکٹر اشفاق احمد عمر نے ڈاکٹر صاحب سے ایک طویل انٹرویو لیا تھا جو اردو دنیا کے ماہ دسمبر 2015 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو سے ان کی کاوشات اور بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ابھی حال میں ہی ''ضیا بار افراد'' کے نام سے خطوط کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جو علمی دنیا کے بہت سے راز سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اس لیے اس مجموعے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔واقعہ یہ ہے کہ مجموعے کے مطالعے سے ڈاکٹر صاحب کے انضباط اور احتیاط کا قائل ہونا پڑتا ہے نیز ان کی علم دوستی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔آپ کی محنت پیہم مثالی تھی۔غرضیکہ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی بصیرت افروز تحریریں اور افکار وخیالات موجود ہیں جو ہمیں دیر تک ضیا بار کرتی رہیں گی ۔بے شک پروفیسر اصغر عباس دنیائے اردو میں ایک بے مثال شخصیت کے مالک تھے اور کامیاب نثر نگاری کی وجہ سے جانے جائیں گے۔اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ ؎

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

☆☆☆

رفعت عزمی: یادوں کے چراغ جلتے ہیں

فرید بلگرامی

(موبائل:737847648)

محترم رفعت عزمی (۲۷/نومبر ۱۹۵۲ تا ۲۲/اکتوبر ۲۰۲۲) شعروادب کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اور استاد شاعر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ زبان پر ان کی پکڑ کافی مضبوط تھی اور لوگوں کو ان کی غلطی پر برملا ٹوک دیا کرتے تھے۔ اس لیے بعض لوگ ان سے خفا بھی ہو جاتے۔ اس کے باوجود وہ درست بات کو کہنے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ تھے بھی تو وہ خانوادۂ مضطر خیرآبادی کے چشم و چراغ۔ اس لیے زبان ان کی گھٹی میں رچی بسی تھی۔ ادب وتہذیب کے پیکر میں تراشی ہوئی ان کی شخصیت سے لوگ بلا تکلف جڑاؤ محسوس کرنے لگتے۔ ان سے میری پہلی ملاقات نیا دور کے دفتر میں ۲۰۱۵ء میں ہوئی تھی۔ میں نے ان سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا "میں فرید بلگرامی"۔ تو فوری جواب آیا "میں آپ کو جانتا ہوں، آپ کی کتاب "وسیم خیرآبادی: حیات اور کارنامے" پر نیا دور میں شائع ہونے والا تبصرہ میں نے ہی لکھا تھا۔" اس پر میں متعجب ہو ہی رہا تھا کہ انہوں نے مزید کہا "میں آپ کو تب سے جانتا ہوں جب آپ قومی آواز کے لئے اعزازی نامہ نگاری کیا کرتے تھے"۔ ظاہر ہے اس تفصیلی تعارف پر خوش ہونا فطری تھا۔ ۲۰۱۵ء میں ہونے والی یہ ملاقات آپسی رشتے کی راہ کی ایسی سنگ میل ثابت ہوئی کہ جلد ہی ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم بن گئے۔ اس رشتے کو مضبوطی عطا کرنے کا ذریعہ بنا موبائل فون۔ اور پھر ''خیرآبادیت'' کے تعلق نے بھی ہمارے رشتے کو دوام بخشنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ رفعت عزمی کا ادبی ذوق نہایت اعلیٰ تھا۔ ہوتا بھی کیوں نہیں، کہ ان کا تعلق اس خاندان سے تھا جس نے میدان ادب میں شاندار کارنامے انجام دیے ہیں۔ خانوادۂ مضطر خیرآبادی کے فرد ہونے کے ناطے انہیں خیرآباد سے نہایت جذباتی لگاؤ تھا۔ مضطر خیرآبادی کے بیٹے اعتبار حسین برتر کی بیٹی قدسیہ بیگم آپ کی والدہ گرامی تھیں جو خود شاعرہ اور مصنفہ تھیں اور محشر تخلص کرتی تھیں۔ اس طرح شعروادب کا ذوق ان کو وراثت میں ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خانوادۂ مضطر سے ان کا لگاؤ والہانہ اور جذباتی انداز کا تھا۔ آپ خاندان کے ایک ایک فرد سے رابطہ رکھتے اور ان کے دکھ درد میں شامل رہتے۔ ۲۰۱۵ء میں جب معروف فلمی نغمہ نگار جاوید اختر اپنے دادا مضطر خیرآبادی کے دیوان ''خرمن'' کی رسم اجراء کی تقریب کے لیے خیرآباد آئے تو عزمی صاحب نے جاوید اختر سے نہ صرف میری ملاقات کرائی بلکہ تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ فرید بلگرامی ہیں اور خیرآباد پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ یہ سن کر جاوید اختر بے حد خوش ہوئے اور دیر تک مجھ سے میری کتابوں کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ آخر میں رفعت عزمی نے جاوید اختر کے ساتھ میرا ایک فوٹوسیشن بھی کرایا۔

رفعت عزمی سے میرے تعلقات میں نیا موڑ اس وقت آیا جب میں نے ۲۰۱۹ء میں "دبستان خیرآباد" لکھنا شروع کیا۔ اس کتاب میں

عزمی صاحب نے اتنی زیادہ دلچسپی لی جیسے کوئی اپنی کتاب میں لیتا ہے۔ میری کتاب کی نوک پلک درست کرنے میں جی جان لگا دی۔ میں نے بھی ان کی ہر رائے کا احترام کیا۔ میری اس کتاب میں عزمی صاحب کے خاندان کے ۲۶/افراد (شعراء واد باء) شامل ہیں۔ متعلقہ افراد کے کوائف، ان کی تصاویر اور نمونہ کلام مہیا کرانے میں بڑی جد و جہد کی۔ میں نے اس کتاب پر نظر ڈالنے کے لئے مسودہ ان کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے تقریباً ایک مہینے تک اس کا بنظر غائر اور بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اہم اور ضروری مقامات پر پنسل سے نوٹ لکھے اور کتاب کا مسودہ اردو اکیڈمی میں جمع کرنے سے لیکر طباعت تک، ہر مرحلے میں وہ میرے معاون اور مددگار بنے رہے۔ جب ''دبستان خیرآباد'' طبع ہوکر آ گئی تو سب سے پہلا نسخہ لیکر ان کی خدمت میں پیش ہوا۔ بارہ بنکی پہنچ کر کتاب کا پہلا نسخہ دیتے ہوئے عرض کیا کہ اس اولین نسخے کے اصل حقدار آپ ہی ہیں کیوں کہ آپ نے بے لوث ہو کر اس کتاب کی ترتیب و طباعت میں جتنی مدد کی ہے، اس کا لازمی تقاضہ تھا کہ میں یہ خوشگوار فریضہ انجام دوں۔ میری اس بات پر وہ بے حد خوش ہوئے۔ کتاب نہ صرف بصد شوق قبول کی بلکہ ساتھ میں تصویر بھی کھنچوائی۔ پھر اس پورے خبر کی فیس بک اور مختلف اخبارات کے ذریعے خوب خوب تشہیر بھی کی۔ یہ ان کا بڑکپن تھا کہ کتاب کی طباعت کے بعد انہوں نے اس کی تشہیر و توسیع میں بھی بڑا حصہ لیا۔ اپنے خاندان کے افراد جو کہ تقریباً سبھی شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان سب تک کتاب پہنچائی۔ شہزاد رضوی اور ضیا خیرآبادی کو جو امریکہ میں مقیم ہیں، ان کو بھی کتاب کے نسخے بھجوائے۔ جاوید اختر (ممبئی) کو فون کر کے کتاب کی اشاعت سے متعلق تفصیلات سے آگاہ کیا اور نسخے بھجوائے۔ کتاب کے مطالعے کے بعد جاوید اختر نے اپنے جن پر مسرت خیالات کا اظہار کیا، اس سے مجھے بھی مطلع فرمایا۔ عزمی صاحب کا اصرار تھا کہ کتاب کی باقاعدہ رسم اجراء کی تقریب منعقد کی جائے۔ ان دنوں کووڈ کا دور چل رہا تھا۔ جب کچھ سہولتیں میسر ہوئیں تو میں نے ان کی رائے سے ۲۱/نومبر ۲۰۲۱ء کا دن طے کیا۔ کارڈ چھپ گئے، تقسیم بھی ہو گئے اور عزمی صاحب پھر بیمار پڑ گئے۔ صاحبِ فراش یہاں تک کہ وہ اس تقریب میں شرکت کے قابل نہ رہے۔ ایسی صورتحال میں انھوں نے تقریب میں شرکت سے معذرت کر دی۔ میں نے ہمت کر کے عرض کیا کہ تقریب کے روح رواں آپ ہیں، مہمان خصوصی آپ ہیں، آپ کے بغیر تقریب کیسے سج پائے گی۔ میری اس بات پر انھوں نے نہ جانے کس غیبی قوت کے سہارے تقریب میں شرکت کی حامی بھر دی۔ بہر حال وہ تشریف لائے لیکن ہاتھ میں ویگو (Vego) لگی ہوئی تھی، کانپتے کراہتے اسٹیج پر جلوہ افروز ہوئے۔ دوران تقریر کمزوری کی وجہ سے کانپنے لگے تھے، یہ منظر دیکھ کر میں شرمندگی سے بھر گیا۔ لیکن ان سب کے باوجود اپنی تقریر میں انھوں نے کتاب کی جزئیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور خیرآباد سے اپنے رشتے اور خانوادۂ مضطر خیرآبادی اور ان کی ادبی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا۔ ''دبستان خیرآباد'' جب اردو ویو پبلشر لاہور (پاکستان) سے شائع ہوا تو میں نے اس کی اطلاع انہیں دی، وہ بے حد خوش ہوئے اور اس سلسلے میں طرح طرح کی ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ میں پاکستانی نسخہ ضرور حاصل کروں اور انہیں محفوظ کرلوں۔

وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر نگاہ رکھتے تھے جب میں نے اپنی کتاب ''گلزار وسیم'' جس میں وسیم خیرآبادی کے ۱۵۰/تلامذہ کے سوانحی کوائف اور نمونۂ کلام شامل ہے، کا سرورق انہیں بھیجا تو انہوں نے کہا کہ آپ نے صرف سرخ پھول لگائے ہیں، گلزار میں رنگ برنگے پھول ہوتے ہیں، صرف ایک رنگ کے پھول، چہ معنی دارد؟ پھول رنگ برنگے ہونے چاہئیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی دقت نظری کی سطح کیا تھی۔ ان کی دقت نظری کی اور مثال ملاحظہ کیجئے کہ جب میں نے اپنی ایک اور کتاب ''تاریخ خیرآباد'' کا سرورق بھیجا تو کہنے لگے اوپر مکا جمعدار کے امام باڑے کی تصویر اور نیچے نیاز یہ اسلامیہ اسکول کی تصویر۔ بتائیے پہلے کون سی عمارت بنی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ امام باڑہ ۱۸۳۸ء کا ہے اور مدرسہ نیاز یہ ۱۹۰۱ء میں تعمیر ہوا ہے، اس لیے مدرسہ کی تصویر نیچے اور امام باڑے کی تصویر اوپر ہے تو فرمایا، تب ٹھیک ہے، سنین کے اعتبار سے ہی اولیت دی جانی چاہئے۔

عزمی صاحب اپنی استطاعت کی حد تک ہر ممکن مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہا کرتے تھے۔ مجھے اپنی کتاب ''گلزار وسیم'' کی تیاری کے دوران بطور مواد گورکھپور سے چند کتابیں درکار تھیں، کیوں کہ وسیم خیرآبادی کے سب سے زیادہ شاگرد گورکھپور سے ہی متعلق تھے تو آپ نے اپنے روابط کا استعمال کرتے ہوئے مجھے کئی کتابیں مہیا کروائیں۔ اس سے ان کی علمی معاونت کے مزاج کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی انہیں حفظِ مراتب کا بھی بڑا پاس رہا کرتا تھا۔ ایک بار ان سے میں نے بتایا کہ نیشنل بک ٹرسٹ ہندی کے ایڈیٹر نے میرے ایک خط کے جواب میں جو جواب دیا ہے اس میں

وہ باتیں لکھی ہیں جس کا تعلق میرے خط سے ہے ہی نہیں اور اصل بات گول کر دی گئی ہے۔ اس پر میں نے ایڈیٹر کو دوبارہ خط لکھا اور بولا کہ جناب والا آپ نے میرے خط کا مطالعہ نہیں کیا جو ڈرافٹ آپ کے بابو نے تیار کر دیا آپ نے اس پر دستخط کر دیے ہیں۔ اگر خط کا مطالعہ آپ کر لیتے تو شاید جواب یہ نہ ہوتا۔ اس ترش روئی کی روداد سن کر عزمی صاحب نے فرمایا آپ کو ایسا نہیں لکھنا چاہیے تھا، آپ کو ان کو عہدے کے وقار کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ ان کی اس توجہ دہانی پر میں بڑا نادم ہوا۔ دیکھیے شاید عزمی صاحب جیسی نفیس ہستیوں کے لیے ہی شاعر نے کہا تھا کہ "ایسی چنگاری بھی یارب، اپنے خاکستر میں ہے"۔

گزشتہ تقریباً ایک سال سے ہم اور بھی قریب آ گئے تھے، اس کی وجہ تھی میری زیر تصنیف کتاب "خیر آباد اودھ۔ تاریخ اور تاریخ ساز شخصیتیں"۔ اس کتاب میں علامہ فضل حق کے گھرانے اور مضطر کے گھرانے کی وہ شخصیتیں شامل ہیں جن کی سماجی، سیاسی حیثیت مسلمہ تھی (اس کتاب میں ادبی شخصیات کا ذکر نہیں ہے)۔ کتاب کے حوالے سے ان سے تقریباً روزانہ ہی بات ہو جاتی تھی۔ گفتگو صرف اس کتاب تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ وہ ردولی سے متعلق کسی کتاب پر کام کر رہے تھے، اس لیے ردولوی سے متعلق اصحابِ قلم شخصیات کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔ قدیم تذکروں میں جب کسی ردولوی کا ذکر مل جاتا تو میں انہیں اس کی تفصیل بھیج دیتا۔ وہ بہت خوش ہوتے جیسے ان کی متاعِ گم گشتہ انھیں مل گئی ہو۔ اس سے محسوس ہوتا تھا کہ قصبہ ردولی کو وہ ادبی نقشے میں واضح کرنے کی جتن میں کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ میں نے ایک بات یہ بھی محسوس کی تھی کہ حق تلفی یا ادبی ناانصافی کے وہ بے حد خلاف تھے۔ ان کا میں رکھے تھے وہ سب ریزہ ریزہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ ذاتی اختلاف یا نظریاتی اختلاف کی وجہ سے کسی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ ابھی حال ہی میں ایک کتاب آئی تھی جس میں بہت سے اہم "ردولویوں" کو بر بنائے وجوہ نظر انداز کر دیا گیا تھا، اس سے وہ کافی دکھی تھے اور اس طرح کی حرکت کو "اخلاقی بدعنوانی" گردانتے تھے۔

اکتوبر کے دوسرے عشرہ سے ان کی آواز میں نقاہت پیدا ہو گئی تھی، پھر فون اٹھنا بند ہو گیا، پھر واٹس ایپ کے ذریعہ خیریت معلوم ہونے لگی۔ ۱۹/ اکتوبر کو ان سے آخری مرتبہ فون پر بات ہوئی وہ جیلانی اور گیلانی کے تلفظ پر بات کر رہے تھے مگر بات کر نہیں پا رہے تھے۔ میں ان سے عرض کیا کہ آپ کی آواز میں کمزوری بہت ہے، آپ بات نہیں کر پا رہے ہیں، پہلے آپ صحتیاب ہو جائیں تو پھر اس موضوع پر آپ سے گفتگو ہوگی۔ ۲۱/ اکتوبر جمعہ کا دن تھا، میں نے فون لگایا، ان کی بیگم سے بات ہوئی، میں نے عرض کیا کہ عزمی صاحب سے ملاقات اور عیادت کا خواہشمند ہوں، کیا حاضر ہو جاؤں۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا مجھے آپ کے اور ان کے تعلقات کے بارے میں علم ہے مگر آج وہ بہت تکلیف میں ہیں، دوا دی گئی ہے، ذرا سو گئے ہیں۔ اس لیے آپ آج نہ آویں تو بہتر ہے، میں دل مسوس کر رہ گیا۔ میں "خیر آباد اودھ- تاریخ اور تاریخ ساز شخصیتیں" کا پرنٹ لیکر گیا تھا تا کہ ان کو دکھا کر ان کی قیمتی رائے حاصل کر سکوں۔ مگر وائے قسمت کہ ۲۲/ اکتوبر سنیچر کی شام ۴:۳۰ بجے عزمی صاحب کے رشتہ دار اور خیر آباد کے میرے پڑوسی جناب کلیم چودھری کا فون آیا "فرید بھائی! عزمی بھائی کا انتقال ہو گیا"۔ یہ چند الفاظ میری سماعت پر بجلی بن کر گرے۔ میں نے جو بہت سے خواب تاریخ خیر آباد اور عزمی صاحب سے متعلق بن

دعائے مغفرت پڑھتے ہوئے عزمی بھائی کو آخری سفر پر روانہ کرنے کے لیے نکل پڑا۔ میں نے بہت سے جنازوں میں شرکت کی ہے مگر عزمی صاحب کے جنازے میں جو مجمع تھا، اس کی حیثیت امتیازی تھی۔ ردولی، بارہ بنکی، لکھنؤ اور دوسرے دور دراز مقامات سے ان کے چاہنے والے امڈ پڑے تھے۔ لیکن نہایت خاموش، نہایت سنجیدہ اور نہایت ذی علم افراد کا مجمع تھا اور سارا کام اس طرح ہو رہا تھا جیسے انسان نہیں بلکہ الیکٹرانک ذی روح ہیں جو متعین راہ پر چل رہے ہیں۔

عزمی صاحب جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو دوسروں کے لئے اتنا خلوص اور سپردگی (Devotion) کا جذبہ رکھتے ہوں، قدم قدم پر رہنمائی کرنا اور ہر طرح کا تعاون کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہوں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے۔ ردولی ان کا منظور نظر موضوع تھا۔ افسوس کہ ان کی نگارشات زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔ کاش کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ ان کی نگارشات منظر عام پر آ جائے۔ میں عزمی صاحب کو روز یاد کرتا ہوں، ان کی محبتیں، ان کا خلوص، ان کا جذباتی لگاؤ، میرے لئے ان کی فکرمندی، یہ سبھی کچھ رہ رہ کر یاد آتی ہیں۔ میری تصنیفی و تالیفی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ قدم قدم پر رہنمائی کرنے والا انسان چلا گیا۔ ان کی یادوں سے متعلق جب یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو میرے قلم سے الفاظ نہیں آنسو ٹپک رہے ہیں۔ میرا ان سے ایسا ہی رشتہ تھا جیسے نجد کا مجنوں سے تھا، کہ وہاں کے صحرا اور ویرانوں کی رونق مجنوں کے دم سے تھی۔ بقول شاعر:

دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

☆☆☆

افسانچہ

ضرورت

رئیس صدّیقی

(سابق آئی بی ایس افسر، آکاشوانی ودوردرشن، نئی دہلی، موبائل: 9810141528)

عورت ہو، مرد نہیں، اپنی اوقات میں رہا کرو۔ یہ مردوں کا سماج ہے۔ عورتوں کا نہیں۔ زمانہ چاہے جتنی ترقی کرلے۔ چاہے جتنے سرکاری، غیر سرکاری کمیشن اور این جی او شور مچائیں، سماج ہمیشہ مردوں کا ہی رہتا ہے!

آئے دن اپنے شوہر شمیم کے اس طرح کے طعنے سنتے سنتے عارفہ کا صبر جواب دینے لگا تھا۔

شادی سے پہلے ہی وہ دہلی کے جمنا پار علاقہ میں ایک سرکاری اسکول میں اردو ٹیچر ہوگئی تھی۔ لیکن شمیم کے پاس کوئی مستقل نوکری نہیں تھی۔ وہ کسی چھوٹے سے اردو اخبار میں سب ایڈیٹر تھا۔ تنخواہ بہت کم تھی لیکن عارفہ کی بھی عمر ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ چلو ہم دونوں مل کر گھر چلالیں گے۔

لیکن شمیم نے کبھی اس کے اِس جذبہ کا احترام نہ کیا۔ وہ ہمیشہ اس احساس کے ساتھ جیتا کہ وہ مرد ہے۔ وہ شوہر ہے۔ اس نے اپنے بڑوں کو ہمیشہ اپنی بیوی کو کم تر سمجھتے دیکھا تھا۔ وہ دلی آکر بھی اپنی ذہنیت نہ بدل سکا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ گھر سے باہر خواتین کو اپنی لچھے دار باتوں سے گرویدہ بنائے رکھتا۔ لیکن گھر میں وہ اپنے اجداد کی طرح ہی شوہر نظر آتا۔ وہ بیوی کو صرف ایک عورت سمجھتا۔

جب بھی وہ کہتا کہ تم عورت ہو۔۔۔۔۔۔ اس کے جواب میں عارفہ یہ کہنا چاہتی کہ تم کیا جانو، عورت ہونے کے معنی! لیکن کبھی بھی وہ یہ کہہ نہ سکی۔ ہمیشہ وہ اپنے رشتہ کی آبرو کی خاطر آنسو پی کر رہ جاتی۔

عارفہ، چائے کا کیا ہوا؟۔۔۔۔۔۔۔ شمیم کی آواز میں کسی حاکم شوہر کا لب ولہجہ تھا۔

میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ خود بنالو یا باہر جا کر پی لو۔۔۔۔۔۔۔ عارفہ نے سپاٹ سا جواب دیا۔

شمیم کو اپنی عورت سے اس طرح کے جواب کی قطعی توقع نہیں تھی۔

وہ جھنجلاتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔۔۔۔ تو پھر شاید کھانا بھی باہر ہی کھانا پڑے گا!

جواب میں عارفہ کی طرف سے خاموشی تھی!

کئی دن تک، دونوں ایک دوسرے سے منھ پھلائے رہے۔ دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ گھر میں ہر چیز بے ترتیب ادھر ادھر پڑی رہتی، میلے کپڑے، ہر طرف دھول، بدبو، منحوس سا ماحول اور گھر میں اندھیری سی خاموشی نے شمیم کو کسی حد تک توڑ دیا۔ وہ ایک دن خود ہی بولا۔

تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ آؤ چلو، ڈاکٹر کو دکھا دیں۔

عارفہ نے اس ہمدردی پر ایک چبھتا سا سوال کیا۔۔۔۔۔۔۔۔ میری فکر ہے یا اپنے آپ کی یا اپنے گھر کی؟

حاضر دماغ، حاضر جواب، تیز طرار، لفاظ اور چرب زبان شوہر اپنی بیوی کے اس سوال کا ایماندارانہ جواب آج تک نہ دے سکا !!!

☆☆☆

(افسانہ نگار آکاشوانی ودوردرشن کے سابق آئی بی ایس افسر اور ساہتیہ اکادمی قومی ایوارڈ و دلی اردو اکادمی ایوارڈ سے سرفراز پندرہ کتابوں کے مصنف، مولف، مترجم، افسانہ نگار، شاعر و ادیبِ اطفال ہیں)۔

تجارت

اشفاق برادر

(مکان نمبر 132/15، بابو پوروہ کانپور، 208023، موبائل نمبر: 7499646978

قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن میں چلنے کو مجبور تھا۔ ذہن میں بجلیاں کوند رہی تھیں۔ میں کیوں بحث میں الجھ پڑا۔ آیا تھا کچھ روز رہنے، گھومنے، اپنے لوگوں سے ملنے مگر حالات ایسے بنے کہ الٹے پیر مجھے جانا پڑا۔۔۔ راہا موڑ پر بس سے اُترا اور پیدل ہی گاؤں کی پکی سڑک کو ناپتا ہوا چچا جان کے گھر آ گیا۔ مجھے دیکھ کر سبھی کے چہرے خوشی سے بھر اُٹھے۔ میں بھی مسکرا اٹھا اور ہنس ہنس کر خیر وخیریت بتانے لگا۔ مغرب کا وقت شروع ہو رہا تھا نمازِ مغرب کی تیاریاں ہونے لگی تو میں بھی وضو کرنے کے لیے کپڑے تبدیل کرنے کی خواہش ظاہر کر دی، مجھے سامنے والے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا۔ وہاں پورا انتظام ہے میاں جاؤ۔۔۔ میرا کزن، میرا بیگ اٹھا کر جانے لگا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔۔۔ پھر میں دالان میں آیا تو چچا جان مصلے پر موجود اور کئی فرد گھر کے، ان میں، میں بھی شامل ہو گیا۔۔۔ نماز ختم کرنے کے بعد چائے آ گئی ساتھ میں نمکین وغیرہ تھا۔۔۔ بات چیت کرتے ہوئے چائے پیتے رہے، امّی نے جو تحفے دیئے تھے میں نے وہ سب لا کر رکھ دیئے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر کھانے کا دور شروع ہوا۔

میں اپنے بستر پر جب پہونچا اس وقت دس بج رہے تھے رات کے، میں تھکا ہوا تھا لیٹتے ہی نیند کی وادیوں میں غرق ہو گیا۔۔۔ صبح مجھے کسی نے جگایا نہیں اور میں نو بجے تک سوتا ہی رہا، بہر حال نہا دھو کر فارغ ہوا اور ناشتے کے لیے کمرے سے باہر آیا تو بھابھی صاحبہ مسکراتے ہوئے بولیں اظہر۔ نیند اچھی آئی۔ ہاں بھابھی، اب ناشتہ کر لو اور میں کرسی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔ ناشتہ کیا تھا پورا کھانا تھا۔ اس وقت گھر میں عورتیں ہی تھیں بچے سبھی اسکول جا چکے تھے اور مرد باغ یا کھیتوں میں۔۔۔

میں بھی کھیتوں کی جانب چل پڑا، راستے میں میں نے دیکھا کھیتوں میں قبریں بنی ہوئی تھیں، سمادھیاں بھی تھیں، مندر بھی، تقریباً تمام کھیتوں میں قبریں، سمادھیاں تھیں، مجھے بڑا عجیب لگا کھیتوں کو کس درجہ محبت کرتے ہیں یہ مدفون معصوم، پیارے لوگ میں اکیلا ہی گھومتا رہا اور گھومتے گھومتے نہر تک آ پہونچا۔ نہر میں برائے نام پانی تھا۔ ہاں کچھ بھینسیں ضرور نہر میں لیٹی ہوئیں تھیں۔ میں یہ سب دیکھتا ہوا لیٹے ہوئے پرانے درخت تک آ گیا، میری چچی نے ایک بار مجھے لیٹے ہوئے درخت کی کہانی سنائی تھی۔ اظہر بیٹے ہمارے گاؤں میں صدیوں پہلے ایک بزرگ آئے تھے انہوں نے یہ درخت لگایا تھا لیکن یہ درخت اوپر نہ جا کر نیچے ہی زمین پر پھیلتا چلا گیا۔ اور آج تک ہرا بھرا بنا ہوا ہے۔ بزرگ کو روپوش ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے لیکن گاؤں

والوں کو ایسا محسوس ہوتا چلا آ رہا ہے کہ بزرگ اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اسی لیے پھول اور اگربتی سے درخت مہکتا رہتا ہے، گاؤں والے بزرگ کی یاد میں لیٹے ہوئے درخت پر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہتے ہیں لوگ تو منتیں ، مرادیں بھی مان لیتے ہیں۔۔۔

بہت غور سے لیٹے ہوئے درخت کو دیکھنے لگتا ہوں، خوشبو سے میری سانسیں مہک اٹھتی ہیں اور میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہوں۔۔۔

لیکن میں زیادہ دیر تک ماحول کا اسیر بن نہیں سکا۔ سر کو جھٹکتا ہوا باغوں کی جانب ہولیتا ہوں ۔ وہاں درختوں کی کٹائی کا کام زور وشور سے چل رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ باغ بہت خوبصورت تھا مجھے اچھی طرح یاد تھا پھر یہ کیوں کاٹا، ختم کیا جارہا ہے؟ میں چچا جان کو وہاں دیکھ کر سوال کرنے سے خود کو روک نہیں پایا اور پوچھ ہی بیٹھا چچا جان۔ یہ باغ تو بہت خوبصورت تھا پھر اس کی یہ حالت کیوں؟ چچا جان نے ایک لمحے کو میری جانب دیکھا اور بولے اب اس کی ضرورت نہیں رہی ، میں نے کہا ضرورت نہیں رہی مگر کیسے؟ چچا جان کو شاید میری بات پسند نہیں آئی وہ اپنے بیٹے طاہر سے بولے اظہر کو گھر لے جاؤ ۔۔۔طاہر نے فوراً ہی مجھ سے کہا۔ چلو اظہر گھر چلتے ہیں، میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور مڑ کر گھر کی جانب چل دیا یہ دیکھے بغیر کہ طاہر آ رہا ہے یا نہیں۔۔۔۔

چچا کی بات سن کر میرے جذبات جل اٹھے تھے، ہمارا بھی تو حق ہے باغوں اور کھیتوں پر، چچا جان اس طرح کیسے کر سکتے ہیں بلا صلاح، مشورہ کے۔ یہ تو سراسر غلط ہے جبکہ میرے والد اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور میں ہی اکلوتا وارث ہوں۔

میں جب گھر میں داخل ہوتا ہوں ، چچی جان صاحبہ میرا چہرہ دیکھ کر پوچھ بیٹھتی ہیں اظہر کیا ہوا؟ میں کچھ کہتا اس سے پہلے ہی طاہر بول بیٹھا کہ اظہر باغ کے بارے میں بابو جی سے پوچھ بیٹھے، گھر پر چچا جان کو سبھی بابو جی کہتے ہیں۔ تو بتا دینا چاہئے کہ باغ کو ختم کر کے وہاں پلاٹنگ ہوگی جس سے بے شمار پیسہ آئے گا۔ اب باغوں میں لاگت زیادہ اور آمدنی کم ہے سبھی ایسا ہی کر رہے ہیں، ارے میاں یہ تو تجارت ہے تجارت، غصہ نہیں۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچو تو سب سمجھ میں آجائے گا۔ رئیسہ بیٹی۔ اظہر بھائی کے لیے دسترخوان بچھا دو۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔

میں حیرت سے چچی جان کو تکتا ہوا پڑے پلنگ پر بیٹھ جاتا ہوں۔

☆☆☆

افسانچہ

بھگوان کی دیوالی

تنویر اختر رومانی

(جمشید پور، موبائل:7004384853)

آج دیوالی ہے، روشنیوں کا تہوار!

دیپا کے چاچا جی نے اس کے لئے ستاروں جیسا چمکتا ہوا فراک خریدا ہے۔ ماما جی پٹاخے اور پھلجھڑیاں لے کر آئے ہیں۔ ماں مٹھائیاں لائی ہے اور لڈّو بھی۔

پچھلے سال تو کچھ بھی نہیں تھا دیپا کے پاس۔ کیونکہ اس کے باپو جی کے پاس پیسے نہیں تھے۔ دیوالی کی شام باپو جی نے اس کے لئے دو ڈبّے پھلجھڑیاں اور تھوڑے سے دیے لائے تھے بس۔ جبکہ اس کی سہیلیوں کے پتا ان کے لئے نئے نئے کپڑے بھی لائے اور ڈھیر سارے پٹاخے بھی۔

پچھلے برس اس نے نئے کپڑے خریدنے کے ضد کی تھی تو باپو جی نے کہا تھا۔ ''دیپا بیٹا! اگلے برس دیوالی پر لا دوں گا۔''

اور وہ خاموش ہوگئی تھی۔

اس دیوالی پر دیپا کے پاس سب کچھ ہے لیکن۔۔۔۔۔

معصوم دیپا کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ بھگوان کے سامنے کھڑی ہوکر بولی۔

''ہے بھگوان! مجھے کچھ نہیں چاہئے۔۔۔۔بس میرے باپو جی گھر بھیج دو۔۔۔۔ان کے بنا میں تمھاری دیوالی نہیں مناؤں گی بھگوان۔۔۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔۔۔۔میرے لئے نئے کپڑے لائیں گے۔۔ڈھیر سارے پٹاخے اور۔۔اور۔۔ماں کہتی ہے، تم نے میرے باپو جی کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔۔کیوں بلا لیا ہے بھگوان؟۔۔کیا بگاڑا تھا میرے باپو جی نے تمھارا۔۔کورونا کو اپنے پاس نہیں بلا سکتے تھے؟''

☆☆☆

امید نو

فاکہہ قمر
(سیالکوٹ، پاکستان)

صبح سے بادل گرج رہے تھے، تیز موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ایک بارش باہر ہو رہی تھی جبکہ دوسری فاطمہ کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔ فاطمہ اپنی زندگی سے بہت ناامید ہو چکی تھی۔ گھر والوں کے خیالات اور ترحم آمیز نگاہوں نے فاطمہ کی شخصیت اور صلاحیتوں کو اندر ہی اندر چور چور کر دیا تھا۔ بظاہر خود کو سارا دن مصروف رکھنے اور بے دلی سے پڑھائی کرتے ہوئے دن کو گزرنا اس کا معمول تھا لیکن رات کو وہ اور اس کی تخیلاتی دنیا اور آنسوں کی جڑی اس کے ساتھی ہوتے تھے۔ وہ ساری رات آنکھوں میں کاٹ کر تکیہ بھگوتے ہوئے خود کو نئے دن کے لیے تیار کرتی تھی، درحقیقت وہ خود اندر سے ٹوٹ چکی تھی۔

****

میڈم! آپ کی کامیاب زندگی کا راز کیا ہے؟ ایک اینکر پرسن نے مائیک فاطمہ کی جانب بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔
"مسلسل جدوجہد اور جاگتی آنکھوں کے خواب" فاطمہ نے مسکراتے ہوئے مختصراً جواب دیا۔

****

پچھلے چند ماہ سے فاطمہ کو دور کے منظر دیکھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ سکول کا ہوم ورک کرنے بیٹھتی تو کاپی پر لکھے الفاظ کیڑے مکوڑوں کی مانند نظر آتے۔ حتیٰ کہ سکول میں بورڈ پر لکھی تحریر پڑھنے سے بھی قاصر تھی۔ پہلے پہل تو اس نے اتنا دھیان نہیں دیا لیکن جب سر میں شدید درد رہنے لگی تو اس نے امی کو اپنا مسئلہ بتایا۔

امی کا خیال تھا کہ فاطمہ بہانے بنا رہی ہے تاکہ کام نہ کرنا پڑے۔ وقت یوں ہی گزرتا گیا۔ ابو کو اپنی کاروباری مصروفیات کی بناء پر فاطمہ کو ڈاکٹر پر لے جانے کا وقت نہیں مل رہا تھا۔ سب کی حتمی رائے تھی کہ ٹی وی دیکھنے سے فاطمہ کی نظر کمزور ہو گئی ہے جس کے باعث نظر کی عینک لگے گی لیکن ان کے پیروں تلے سے زمین تب نکلی جب دو ماہ کے صبر آزما طویل لمحوں کے بعد فاطمہ ڈاکٹر کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کرتے ہی سوالات داغ ڈالے۔
''کیا بچی کے سر پر کبھی شدید چوٹ لگی ہے؟''
''کیا نظر کا مسئلہ بچپن سے ہے؟''
''کیا خاندان میں کسی کو آنکھوں کی کوئی بیماری ہے، خاص کر والدین میں؟''

ڈاکٹر کے اوپر تلے کے بے تکے سوالوں سے فاطمہ کے گھر والے حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

''سب خیریت ہے نا ڈاکٹر؟'' ابو نے ہمت کر کے پوچھ ہی ڈالا۔

''جی نہیں! بچی کو کالا موتیا ہے جس کے عوض ایک آنکھ بالکل ناکارہ ہوگئی ہے جبکہ دوسری کا اگر بروقت آپریشن نہ کیا گیا تو خدانخواستہ ضائع بھی ہوسکتی ہے۔'' ڈاکٹر نے تو بڑے آرام سے یہ خبر سنادی تھی لیکن یہ خبر فاطمہ اور اس کے گھر والوں پر کسی ایٹم بم کی مانند برسی تھی۔

بہت معذرت کے ساتھ لیکن اس کی نظر بہت حد تک ضائع ہو چکی ہے، محض ایک آنکھ ہے جو آخری اور واحد سہارہ ہے اب رہتی زندگی تک۔ ڈاکٹر نے بارہ سالہ فاطمہ کی آنکھوں کا معائنہ کرتے ہوئے بے بسی سے اپنی رائے دے ڈالی۔

''آہ! صرف ایک آنکھ؟؟؟''

امی نے بے اختیار ہو کر فاطمہ کو اپنے سینے سے لگالیا۔

ماں کی ممتا کی ملتے ہی فاطمہ دل چھوڑ کر رونے لگی۔

اس صورتحال پر سب نم آنکھوں اور افسردہ چہروں کے ساتھ زندگی کی ستم ظریفی دیکھ رہے تھے۔

''کیا اس کا کوئی حل نہیں؟'' کچھ دیر کے بعد فاطمہ کے ابو نے ہمت کر کے ڈاکٹر سے پوچھا کہ شاید کوئی نئی کرن مل جائے۔

''بہت افسوس کے ساتھ مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمیں مجبوراً دونوں آنکھوں کا باری باری آپریشن تو کرنا پڑے گا لیکن بینائی صرف ایک آنکھ میں ہی ہے جس کو بچانے کے لیے جلد از جلد آپریشن ضروری ہے''۔ ڈاکٹر نے اصل حقیقت اور صورتحال سے فاطمہ سمیت سب کو آگاہ کر دیا تھا۔

''لیکن ڈاکٹر! کیا ڈراپس سے فائدہ نہیں ہوسکتا ہے؟ آپریشن کرنا ضروری ہے کیا؟'' امی نے پریشان ہوتے ہوئے ڈاکٹر سے بات کی۔

''دیکھیں! مستقل طور پر دوائی استعمال کرنے سے کوئی خاطر خواہ فرق نہیں پڑتا اس لیے ہم مزید رسک نہیں لے سکتے۔ جتنی دیر کریں گے اتنا ہی نقصان ہوگا''۔ ڈاکٹر نے سب کچھ عیاں کر کے رکھ دیا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب ابھی تو یہ بہت چھوٹی ہے اس عمر میں آپریشن کرنا کچھ غیر مناسب نہیں ہے؟'' ابو نے فکرمندی سے اپنی پریشانی ڈاکٹر کے ساتھ شیئر کی۔

''دیکھیں جناب! آپریشن شوق سے تو نہیں کیا جاتا نا۔ بچی کی عمر چھوٹی ضرور ہے لیکن آپ یہ بھی دیکھیں کہ آنکھیں ہیں تو زندگی ہے ورنہ سب بے کار ہے۔'' اب کے ڈاکٹر نے بغیر کسی لگی لپٹی کے سب کچھ واضح طور پر کہہ دیا تھا۔

****

''زندگی کا کیا بھروسہ ہے؟ اگر آپریشن کامیاب نہ ہوا اور یہ اندھی ہوگئی تو؟'' امی نے اپنے خدشات کا اظہار فاطمہ کے ابو کے سامنے کیا۔

''ایسی باتیں نہیں کرتے۔ اللہ سے خیر کی توقع رکھو انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' ابو نے امی کو مثبت پہلو تھماتے ہوئے حوصلہ دیا۔

''لیکن اب اس کی زندگی بے کار ہے؟ کیا کرے گی زندگی بھر؟ اسے سکول سے اٹھوا کر مدرسے میں داخل کروا دیں، دین کی تعلیم حاصل کرے گی تو دین اور دنیا دونوں سنور جائے گے۔'' امی نے اپنی منتشر سوچ کو عیاں کر کے فاطمہ کے ابو کے سامنے رکھ دی۔

''ارے! نہیں نہیں۔ کچھ نہیں ہوگا لیکن سکول سے نہیں اٹھوانا جتنا پڑھ سکتی ہے پڑھنے دو۔'' ابو نے امی کی سوچ کی تردید کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔

دونوں آپس میں بحث کرتے اس بات سے بے خبر تھے کہ فاطمہ دروازے کے پاس کھڑی سب کچھ سن رہی ہے۔

****

فاطمہ کی زندگی کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ سب کے وہمے اور خدشات دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ فاطمہ کے آپریشن کامیاب ہوگئے تھے، جو نقصان ہونا تھا ہوگیا تھا لیکن اب وہ بھرپور زندگی گزار رہی تھی۔ شاذونادر ہی کوئی جانتا تھا کہ فاطمہ کے ساتھ کیا مسئلہ درپیش ہوا تھا۔ ناامیدی سے امید کی جانب خود سے کڑتے لڑتے آج فاطمہ معاشرے کا ایک فعال رکن تھی۔ ایک دنیا تھی جو اس کی پرستار تھی۔ کوئی جگہ یا محفل نہیں تھی جہاں اس کے نام کی مالا جپی نہیں جاتی تھی۔ مسلسل محنت اور اونچے خوابوں کو پانے کی لگن میں اس کی جدوجہد رنگ لائی تھی کہ اللہ نے نہ صرف ملکی بلکہ غیر ملکی سطح پر بھی اس کو بھرپور عزت اور شہرت سے نوازا تھا۔ یہ سفر آسان نہیں تھا لیکن فاطمہ نے اس کو ممکن بنا کر ثابت کر دیا تھا کہ بہت سے فیصلے انسان کے اپنے اختیار میں ہوتے ہیں، بروقت درست سمت اور خواب پانے کی جستجو میں انسان ایک دن ضرور کامیاب ہوتا ہے۔

☆☆☆

ایک جادوگر

عقبیٰ حمید

(628S/41A، سرودیہ نگر، نزد جامع مسجد، اندرا نگر، لکھنؤ 226016)

اماں مجھے کچھ پیسے دے دو نہ مجھے جادو دیکھنے جانا ہے۔ میرے جمع کیے پیسے بھی خرچ کر دیا آپ نے میں کیسے جادو دیکھوں گا۔ راموموہن سبھی گئے۔ میں دیئے تو دیتی ہوں پر بابو جی سے نہ بتانا۔ ٹھیک ہے اماں۔ جلدی آ جانا۔ ٹھیک ہے، میری پیاری اماں۔ گوپال کہتے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ گاؤں میں لگے سرکس دیکھنے چلا گیا۔ گوپال ابھی آٹھ سال کا تھا بابو جی کے لاکھ سمجھانے پر بھی گوپال کی جادو سے دلچسپی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ گوپال تیسری کلاس میں پڑھتا تھا لیکن اس کا دل جادوگری میں زیادہ تھا۔ کسی کی پنسل چرا کر کچھ کچھ بنا دینا اس کا کام تھا۔ ماسٹر جی جب بھی آتے گوپال کی شکایتیں کرتے، اس کے طرح طرح کے جادو کے بارے میں بتاتے، اس کی پڑھائی کو لے کر فکر مند ہوتے۔ کافی دیر تک بابو جی اور ماسٹر صاحب میں باتیں ہوتی رہتی، ان کے جانے کے بعد تو گوپال کو پتہ ہوتا کہ کیا ہونے والا ہے۔

اماں کے پیچھے چھپا گوپال بابو جی کے لاکھ چلانے پر بھی نہ آتا جب تک کہ بابو جی خود اٹھ کر اس کے پاس نہ آ جاتے، ایک دو تھپّڑ نہ رسید کر دیتے۔ اماں گوپال کو سمجھاتی، دلار کرتی، بیٹا تمہیں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننا ہے۔ بابو جی کی طرح کسان تھوڑی بننا ہے۔ تمہیں تو چاند تک جانا ہے پورے گاؤں کا نام روشن کرنا ہے۔ اماں میں چاند کو زمین پر لا دوں تو یہ دیکھو چاند زمین پر مٹی میں بنائے چاند دکھا کر ہنسنے لگتا۔ ہاں ہاں چلو بیٹا یہ تو اپنے زندگی پر بس رہے ہو بابو جی کی غصے سے بھری آواز گوپال اور اماں کی ہنسی کو اڑا دیتی۔ ارے ابھی چھوٹا ہے دھیرے دھیرے سمجھنے لگے گا۔ ہاں دیکھو کب سمجھتا ہے تمہارا بیٹا۔

کیا ہوا ماسٹر جی آج ہم لوگوں کو کیوں بلائے ہمارا گوپال تو ٹھیک ہے۔ تمہارا گوپال تو ٹھیک ہے پر آج اگر میں صحیح وقت پر کلاس میں نہ پہنچتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ ایسا کیا کر دیا گوپال نے۔ اماں نے حیرانی سے پوچھا۔ آج آپ کا بیٹا پردھان کے بیٹے کو صندوق میں بند کر دیا تھا۔ بابو جی کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا۔ میں آج ہی گوپال کو اسکول سے نکال دوں لیکن آپ کا بیٹا ہے یہی سوچ کر معاف کر دیتا ہوں، آگے خیال رکھئے۔ ایسی حرکت نہ کرے۔

اب تو معاف کر دیجئے، دو دن ہو گئے آپ اس سے بات بھی نہیں کر رہے ہیں۔ کتنا مارے، معافی بھی منگوائے۔ اب کیا اس بیچارے کی جان لے لیں گے۔ بچہ ہے سمجھ جائے گا۔ اس لیے تو معاف کرتا آ رہا ہوں آج تک۔

لے پرشاد کھا اور تو اندر کیوں نہیں آتا، مندر میں اتنا ہنس کیوں رہا ہے، اس لیے اماں کیوں کہ جس سے بابو جی چڑھے ہیں ان کی تو تو پوجا کرتی ہے۔ کیا کہہ رہا ہے، صاف صاف کہہ۔ ارے اماں تو کہتی ہے، بھگوان اس مندر میں ہے تو اس کائنات کا لکھا جوکھا کون دیکھتا ہے۔ یہی بھگوان ہی نا، تو کون بڑا جادوگر ہوا؟ اس سے بڑا جادوگر کوئی نہیں۔ اس دنیا میں بہت جادوگر ہیں اماں۔ لیکن سب سے بڑا جادوگر بھگوان ہے۔ گوپال، گوپال کیا ہوا، گوپال کی اماں کیوں نیند میں چلا رہی ہو؟ کچھ نہیں۔

آج رات تم کیوں بڑبڑا رہی تھی۔ میں نے خواب دیکھا جی جیسے گوپال مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ جب سے گوپال گیا اس کی کچھ خبر بھی نہ ملی۔ سوچتی ہوں یہ غم لے کر میں کتنے دن جی پاؤں گی! کیا گوپال کو ہماری یاد نہیں آتی، کب تک روتی رہوگی گوپال کی اماں۔ میں نے سب جگہ تو ڈھونڈا، پولیس تھانہ بھی گیا، پر کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ میرا دل کہتا ہے ہمارا گوپال ایک دن ضرور آئے گا، اپنے بوڑھے ماں باپ سے ملنے۔

گوپال تجھے کتنی بار کہا ہے کہ کام کے وقت جادوگری مت کیا کر۔ جی سیٹھ، لیکن سر گوپال سے ہی آپ کے اس ریسٹراں کی رونق ہے۔ سبھی کے چہرے ہنستے رہتے ہیں۔ آپ کے ریسٹراں سے بہتر کہیں اور کھانا تو ملتا ہے، پر یہ ہنسی نہیں ملتی اور موٹی عورت جس کا پتیلا جیسا چہرہ جس کے ماتھے پر گول بڑی سی لال بندی اور آنکھیں مانو! بھینس کی ہو، لال موٹے ہونٹ، چمکتی بنارسی ساڑی، نگ جڑے ناگرے، چمچماتی پرس جس سے سیٹھ کو نوٹ گن کر دے رہی تھی۔

یہاں آؤ، کہاں رہتے ہو تم، اسی ریسٹراں میں میڈم۔ اچھا ممبئی میں کب سے ہو؟ دس سالوں سے۔ سیٹھ تم کیوں نہیں اس کو جادو سکھاتے ہو۔ ممبئی تو جادو نگری ہے۔ تیرے بہت کام آئے گا یہ لڑکا۔ آپ کچھ بتا دیجئے مجھے۔ اس بارے میں کچھ نہیں آئیڈیا ہے؟ ایسا کرو اس کو کل صبح میرے پاس بھیجو۔ گوپال جھٹ سے بول پڑا ٹھیک ہے صاحب! میں کل صبح ضرور آتا ہوں۔ یہ کارڈ لے لو میرا، اس میں ایڈریس ہے۔ سن رہا ہے نہ، کل جلدی اٹھ جانا۔ سیٹھ کو کیا پتا میں رات بھر سوؤں گا ہی نہیں۔

کون ہے؟

جی میڈم میں گوپال۔ وہی موٹی عورت اوندھے منھ پلنگ پر پڑی تھی۔

آؤ گوپال تم کا ہے کو اس کنجوس سیٹھ کے پاس پڑے ہو، تم اپنے ہنر کو کیوں نہیں نکھارتے، تم اس کے لیے نہیں بنے ہو۔

گوپال! جی میڈم۔ آؤ میرے ساتھ یہ دیکھو میرا اسٹوڈیو ہے جس میں یہ سب پریکٹس کر رہے ہیں۔ بڑے شوکراتے ہیں ہم۔

تم چاہو تو جوائن کر سکتے ہو۔ اس کے بدلے تمہیں اسٹوڈیو کی دیکھ بھال کرنی پڑے گی۔ ایک بڑا سا ہال جس میں بارہ، تیرہ آدمی اور کم عمر لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ طرح طرح کا سامان تھا۔ اس بڑے سے ہال کی چھت سے نہ جانے کتنی رسیاں لٹک رہی تھیں۔ اس پر کچھ لڑکیاں جمپ کر رہی تھیں۔ کیسے ہو گوپال؟ کل تمہارا یہاں پہلا شو ہے۔ آج اچھے سے پریکٹس کر لینا۔ جی۔ گوپال رات بھر پریکٹس کرتا رہا۔ نہ جانے کس پہر سویا تھا۔ بھور میں ہی میڈم کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ابھی تو وقت ہے گوپال، اتنی جلدی جا کر کیا کریں گے۔ ابھی پوری ممبئی اس وقت سو رہی ہوگی۔ تم بھی تھوڑا آرام کر لو۔ نہیں میڈم۔ آپ سو جایئے میں یہیں انتظار کرتا ہوں۔ گوپال نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہا۔ اپنے ہاتھوں سے کچھ اشارے کرتا رہا۔

آج بچپن کا خواب سچ ہونے والا تھا، گوپال کے اپنے پچھلے اسکول کا وقت یاد آ رہا تھا، جب وہ جادوگری سے سب کو دکھ پہنچاتا تھا، آج اسے سب کو ہنسانا تھا۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ چاروں طرف لائٹیں لگی تھیں۔ گوپال اسٹیج پر تھا، اس کے ساتھ اس کے کچھ ساتھی بھی تھے۔ گوپال نے چھڑی گھماتے ہی اپنے ہاتھ پر رکھے انڈے کو مرغی بنا دیا۔ اسی طرح گوپال نے طرح طرح کے جادو دکھائے۔ پوری محفل ہنستی رہی اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے ہال گونجتا رہا۔

آج اس کے سارے خواب سچ ہو رہے تھے، مانو! اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ ماسٹر صاحب کی ڈانٹ اور بابو جی کا غصے بھرا چہرہ اسے یاد آتا رہا۔ کاش کی وہ میرے سامنے ہوتے اور مسکرا کر کہہ دیتے مبارک ہو بیٹا! تم تمہارا پہلا شو۔ آج تمہاری محنت رنگ لائی۔ تم ایک بہت بڑے جادوگر بن گئے بیٹا۔ گوپال نے ان تالیوں کے بیچ اپنے آنسوؤں کو پی لیا۔ اماں کا مسکراتا چہرہ اسے ضرور یاد آتا رہا۔ میرا بیٹا ایک دن بہت بڑا آدمی بنے گا۔ ہاں اماں آج میں بہت بڑا آدمی بن گیا۔ دیکھو نہ میرے پاس کتنے روپیہ ہیں، دیکھو نہ اماں کچھ بولو نہ اماں۔ گوپال اماں کی تصویر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

گوپال کا شو دن بہ دن مشہور ہوتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ گوپال بھی۔ موٹی میڈم کے تھیٹر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اب گوپال نہ کرتا۔ ممبئی میں گوپال نے اپنا ایک گھر لے لیا تھا اور کچھ نوکر بھی رکھ لیے تھے۔ اب گوپال اپنی گاڑیوں سے چلتا۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں کی بھیڑ ہو جاتی۔ اب گوپال کے شو ویدیش میں بھی ہوتے۔ گوپال حد سے زیادہ بزی رہتا۔ گوپال کے ہنر کی چرچا پورے دیش میں ہونے لگی تھی۔ اس سے ملنے کے لیے اجازت لینی پڑتی اور وہ ایک بڑے جادوگر کے روپ میں جانا جانے لگا تھا۔ اس شو کی ٹکٹ ایسے بکتی جیسے دیوانند کی فلموں کی ٹکٹ ہو۔

موٹی میڈم کی پیاری سی بچی تھی جسے اس نے اس دنیا (جادوگری کی) سے بہت دور رکھا تھا۔ اس کی شادی گوپال سے کرانا چاہتی تھی۔ ایک دن موقع پا کر اپنی بات رکھ دی۔ گوپال بھی انکار نہ کر سکا۔ دونوں کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی۔ ممبئی کے مشہور لوگوں نے شرکت کی۔ دونوں کو دعائیں دیں۔ موٹی میڈم مرنے سے پہلے سب کچھ اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر گئی۔

سر! کیا آپ کی بھی لائف میں دکھ ہے؟ آپ کو تو پورا دیش پیار کرتا ہے۔ اتنا بڑا ایوارڈ آپ کو ملا، آپ کیا کہنا چاہیں گے۔ مجھے اتنا پیار اور عزت دینے کے لیے پورے دیش کا شکریہ۔ پر سچ تو یہ ہے کہ گوپال ہی جانتا ہے کہ گوپال کو کتنا دکھ ہے۔

آج میں جتنی اونچائی پر ہوں، اتنا ہی تنہا ہوں۔ میرے بابو جی کی ہی طرح میرا بیٹا بھی مجھ سے نفرت کرتا ہے اور میرے کام سے۔ اس کو یہ سب نہیں پسند۔ وہ کہتا ہے میرے دوستوں کے پاپا ڈاکٹر ہے، بزنس مین ہے، کوئی آئی اے ایس ہے، کوئی بڑا پولیس ادھیکاری ہے، پر آپ ایک نوٹنکی باز ہیں۔ یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ وہ برسوں سے میرے ساتھ نہیں رہتا۔ کہتا ہے لوگ مجھے طعنے دیتے ہیں کہ تم ایک نوٹنکی باز کے بیٹے ہو۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ راستہ اتنا مشکل ہوگا کہ ایک ایک کر کے مجھے میرے اپنے چھوڑ کر جاتے رہیں گے۔ بابو جی کی لال بڑی بڑی آنکھیں مجھے گھورتیں اور کہتیں، تم سچ میں بہت بڑے جادوگر نکلے بیٹا۔ پورا ہال تالیوں کے گڑگڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ سبھی کی نم آنکھیں گوپال کی کہانی بیاں کر رہی تھیں۔ ☆☆☆

مناجات

دیپک روحانی، مدھوبنی
موبائل:9415142314

مرا لفظ لفظ نکھار دے، مجھے گفتگو بھی حسین دے
میں تجھے بیاں میں لاسکوں، سبھی رنگ ڈھنگ مہین دے

میں برا کہوں تو بھلا سنیں، مرے عیب کو بھی ہنر کہیں
میں غزل سرا ہوں نیا نیا، مجھے سامعین ذہین دے

ترا حسن میری کتاب ہے، ترا جلوہ میرا نصاب ہے
میں غزل کا طالب علم ہوں، مجھے اپنے فن پہ یقین دے

نہ تو قافیے کا شعور ہے، نہ ردیف ہی کی تمیز ہے
میں غزل کی پود لگا سکوں، کوئی بہترین زمین دے

نہ اساتذہ کے قریب ہوں، نہ عروض و بحر کا علم ہے
میں غزل پہ جن سے صلاح لوں، مجھے دوست یار متین دے

☆☆☆

نعت پاک

صدام حسین نازاں، پورنوی
موبائل: 9065277474

شہ دیں کے پسینے کا زباں پر ذکر ہر پل ہے
مطہر خود کو رکھنے کا یہی اک پاس میں حل ہے

کمی اس میں کبھی ذرہ برابر بھی نہ آ پائے
"محمد کی محبت دین حق کی شرط اول ہے"

ہو کیوں کھٹکا لحد کا، حشر کا، روز قیامت کا
توکل جب رسول پاک پر، میرا مکمل ہے

مرا ایماں ہے، ذات خالق ارض وسما کے بعد
شفیع روز محشر، اپنی ہر خوبی میں اکمل ہے

جو علم غیب آقا کا ہے منکر واسطے اس کے
حوالہ خود کلام پاک کی آیت، مدلل ہے

بھروسہ رکھ اسی کے صدقے تو جنت میں جائے گا
گزارا تو نے جو شاہ امم کے در پہ اک پل ہے

نبی جتنے بھی آئے اس زمیں پر سارے نبیوں میں
مقام و مرتبہ معراج کے نوشہ کا افضل ہے

اٹھاتا ہے جو انگلی سرور عالم کی عظمت پر
بڑائی کچھ نہیں حاصل اسے، وہ شخص اسفل ہے

رخ شاہ مدینہ کی زیارت کے لیے نازاں!
نگاہیں میری ہیں بے چین، میرا دل بھی بیکل ہے

☆☆☆

غزل

ڈاکٹر اختر ریاض، لکھنؤ
موبائل:9918226052

غموں کی دھوپ بھی سر پر ہے کیا کیا جائے
کہ دور میل کا پتھر ہے کیا کیا جائے

جہاں میں چار سو محشر ہے کیا کیا جائے
"عجیب وقت کا تیور ہے کیا کیا جائے"

تھکن ہے، چاک قبا ہے، ہے میلوں سناٹا
غبار راہ بھی سر پر ہے کیا کیا جائے

تمھیں سکون میسر، ہمیں قرار کہاں
یہ اپنا اپنا مقدر ہے کیا کیا جائے

عجب ہے نظم گلستاں، عجب ہے رنگ چمن
گلوں کو خار کا بستر ہے کیا کیا جائے

شعور بادہ کشی سے بھی جو نہیں واقف
اسی کو جام میسر ہے کیا کیا جائے

وہ جس کی عمر کٹی گھر کو روپ دینے میں
وہ اپنے گھر سے ہی باہر ہے کیا کیا جائے

ہر ایک لمحہ بدلتے ہوئے زمانے میں
پریشاں آج کا آزر ہے کیا کیا جائے

وہ جس نے لوح و قلم کو ہی اپنے بیچ دیا
وہی تو قوم کا رہبر ہے کیا کیا جائے

جو حالِ زار محبت میں آج ہے اپنا
وہ اب بیان سے باہر ہے کیا کیا جائے

ہم اپنا رازِ محبت، کہیں تو کس سے کہیں
کہ ایک بوجھ سا دل پر ہے کیا کیا جائے

جہاں لبوں کا ہلانا بھی جُرم ہو اخترؔ
وہاں خموشی ہی بہتر ہے کیا کیا جائے

☆☆☆

غزل

ڈاکٹر عرفان بالغؔ لکھنؤ

9929444230

پابند غم الفت ہی رہے گو درد دہنداں اور سہی
اشکوں کی روانی تھم نہ سکی آنکھوں کے تھے ارماں اور سہی

آداب چمن انجام تو دے گل سے نہ ہٹا تتلی کو صبا
الفت کی حیا محفوظ رہے گو تجھ میں ہوں طوفاں اور سہی

ہو سعیٔ کرم غیروں پہ اگر اپنوں پہ مذاق عام نہ ہو
ہم راہ میں ہیں ٹھوکر ہی تو دے منزل کے ہوں شایاں اور سہی

اس دشت وفا میں قیس بھی ہے اور شیخ بھی ہے مشتاق ملن
جو وصل نہیں تو کیا غم ہے کچھ لمحے عباراں اور سہی

اک گل جو گرا برنائی میں بلبل کو یہی افسوس رہا
مشغول رہا غم خواری میں ہوں فصل بہاراں اور سہی

انداز صبا سے واقف ہوں اور ربط بحر سے بھی بالغ
رخ موڑ کے چلنا جینا ہے خواہ اس کے ہوں پایاں اور سہی

☆☆☆

غزل

نوشاد اشہرؔ اعظمی

موبائل: 7985535667

سب نے سمجھا تھا چراغوں کے جلانے سے رہی
روشنی بزم میں جو آپ کے آنے سے رہی

یہ تواضع یہ تسلی مرے کس کام کی ہے
جب شکایت ہی نہیں کوئی زمانے سے رہی

کوئی دریا ہی بجھائے گا بجھانا ہے اگر
یہ ہوا دل میں لگی آگ بجھانے سے رہی

خواب؛ امید؛ وفا؛ عشق؛ تمنا؛ چاہت
زندگی ساتھ مرے کتنے بہانے سے رہی

میں مسافر مری منزل ہے بدن کے اس پار
سانس کی ڈور مرا ساتھ نبھانے سے رہی

زرد ملبوس میں آتی ہے نظر یہ جو بہار
پھول خوش رنگ گلستاں میں کھلانے سے رہی

موت آئے تو ہٹے پردۂ اسرار جہاں
زندگی تو ہمیں یہ راز بتانے سے رہی

تختۂ دار سے ابھرے گی صداقت بن کر
یہ حکومت مری آواز دبانے سے رہی

ماہ و انجم ہیں نہ امید کا سورج کوئی
نا امیدی کی سیہ رات تو جانے سے رہی

باز حق گوئی سے میں بھی نہیں آیا اشہرؔ
باز دنیا بھی کہاں زہر پلانے سے رہی

☆☆☆

غزل

شمیم احمد شمیمؔ

بلریا گنج، اعظم گڑھ

موبائل:9598502110

ضیائے زہر کا نشہ گھٹا سے ٹوٹ گیا
سکوت مطرب رنگیں نوا سے ٹوٹ گیا

نشہ غرور کا ظلمت ربا سے ٹوٹ گیا
یہ کافرانہ رویہ حرا سے ٹوٹ گیا

اداس پیڑ پہ بیٹھا جو اک پرندہ تھا
ستم ظریف کی کافر ادا سے ٹوٹ گیا

یہ ماجرا بھی نگاہوں نے میری دیکھا ہے
جو مجھ سے ٹوٹ نہ پایا خدا سے ٹوٹ گیا

چلو تمھارا تو نازک بدن سلامت ہے
مرے وجود کا پیکر بلا سے ٹوٹ گیا

ستارہ چرخ پہ مہ وش کی تاب کیا لاتا
جمال یار کے حسن ادا سے ٹوٹ گیا

نگاہ شوق نے دیکھا جو دست نازک پر
لہو کا زنگ بھی رنگ حنا سے ٹوٹ گیا

گلاب چہرے پہ آشوب جاں کا ماتم ہے
دیے کا حوصلہ زور ہوا سے ٹوٹ گیا

ستم ظریف کو آشوب غم نے گھیر لیا
حصار جبر کا آخر دعا سے ٹوٹ گیا

شمیمؔ داد رسی اب حرم کی کون کرے
بلند کاخ منارہ انا سے ٹوٹ گیا

☆☆☆

سجدے میں

جمیل اختر شفیق، سیتامڑھی
موبائل:9973234929

پتہ چلے گا کہ کتنی ہے شان سجدے میں
لگا کے رکھے تو کوئی دھیان سجدے میں

سبھی رسول و پیمبر سبھی شیوخ وامام
تلاش کرتے ہیں اپنی اُڑان سجدے میں

زمانے بھر سے ملی ٹھوکریں تو یہ جانا
سکونِ قلب ونظر کی ہے جان سجدے میں

ہر ایک عضو بدن کا ہے روبرو اُس کے
لیا نہ جائے مرا امتحان سجدے میں

یہ بات تیری سمجھ سے پرے ہے اے میکش
کہ کیسے ملتا ہے دونوں جہان سجدے میں

حسد، غرور، نمائش سے توڑ کر رشتہ
کوئی بھی ہوتا ہے جا کر مہمان سجدے میں

حسین لوگوں سے کہنا وہ مجھ سے دور رہیں
کہ دی ہے میں نے کسی کو زبان سجدے میں

غموں کی دھوپ کا ہوتا نہیں اثر مجھ پر
ملا ہے جب سے کوئی سائبان سجدے میں

ابھی بھی فتح کی امید دل میں ہے باقی
پڑا ہے حق کا کوئی پاسبان سجدے میں

دیکھو کسی روز سرکو فرصت سے
کسی کے قُرب کا ہوگا گمان سجدے میں

ہو جس کی روح پہ سایا تری تجلی کا
اسے نہ ہوگی کبھی بھی تکان سجدے میں

جنونِ شوقِ عبادت کے بعد زاہد کو
سنائی دیتا ہے رب کا بیان سجدے میں

انھیں سے پوچھو کہ ایمان کا نشہ ہے کیا
کٹا کے آئے ہیں جو خاندان سجدے میں

یہ راز مجھ پہ کھلا مدتوں کے بعد کہیں
حیات ہوتی ہے جنت نشان سجدے میں

رہی نہ دل میں ستائش کی آس دنیا سے
ملا ہے جب سے کوئی قدردان سجدے میں

سیاہ شب کی ریاضت ، جنون اپنی جگہ
ملی ہے مجھ کو یہ شیریں زبان سجدے میں

ہوا سوال اگر حشر میں عمل پہ شفیق
کہوں گا فخر سے نکلی ہے جان سجدے میں

☆☆☆

غزل

کوثر تسنیم سپولی
موبائل: 8757647853

آ جائے جو ہر لفظ کی تفہیم وغیرہ
ہو جائے ہر اِک شعر کی تکریم وغیرہ

ممکن ہے کہ اَشرَاف کے دَم گھُٹنے لگیں گے
آ جاؤں اگر کرنے پہ تعظیم وغیرہ

کچھ لوگ سنبھالیں گے قلم اور قَرطِیس
گر بنتی ہے تنظیم پہ تنظیم وغیرہ

پھر کیجیے اِن بچوں سے تہذیب کی چاہت
پہلے اِنھیں دے دیجیے تعلیم وغیرہ

یک بارگی کس موڑ پہ ہوگا تُو مَیَسَّر
للچاتی ہے قِسطوں کی یہ تقسیم وغیرہ

فانی کا فنا ہونا مُقدَّر میں لِکھا ہے
اِس میں کہاں تاخیر یا تقدیم وغیرہ

خائن ہے وہ، باغی ہے وہ، غدّارِ وطن ہے
سوچے بھی جو آئین کی ترمیم وغیرہ

کوثر ہی اصَل نام ہے، باقی تو ہیں اَلقاب
اِسلامی ہو، تیمی ہو، کہ تسنیم وغیرہ

☆☆☆

سیلفی

مشیر احمد مشیر
موبائل: 9324406948

ایک اداس شام کی کہانی ہے
خاموشیوں کی زبانی ہے
سمندر اور اس کے کٹے پھٹے کناروں پر
دلوں کی دھڑکنیں سرگوشیاں کر رہی تھیں
میں بھی خاموش تھا تم بھی خاموش تھیں
ہاں اک ہیجان تھا جذبات کا ہمارے دلوں میں
لب ہمارے صداؤں سے محروم تھے اور
آنکھیں روشن لفظوں کی تحریریں لٹا رہی تھیں
صرف ہم دونوں ہی پڑھ رہے تھے
کہ اچانک طوفانی ہوائیں چلنے لگیں
خاموش سمندر کی لہریں اچھلنے لگیں
شور سا چاروں طرف برپا ہوا
تم سمٹ کر لپٹ گئیں میرے سینے سے
میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا
میرے ہاتھوں نے موبائل کو سامنے پکڑ کر
ایک آخری سیلفی تمہارے ساتھ لی
جس میں تمہاری آنکھوں میں آنسو کے دیئے
جل رہے تھے
اور میری تصویر مایوسیوں کے گیت گا رہی تھی
آہ! اس سیلفی نے ہاں اس سیلفی نے، ہماری
جدائی کا بھرم کھول دیا تھا

☆☆☆

گمشدہ شناخت

شاد اعظمی ندوی، اعظم گڑھ
موبائل: 9935628735

وطن سے دور بہت دور
جا بسا اک شخص
وہ ایک شخص کہ کہتے ہیں جس کو پردیسی
جو اپنے دیس میں آتا ہے
اجنبی کی طرح
نئی جو نسل ہے
پہچانتی نہیں اس کو
تکلفات سے ملتے ہیں
سب وطن کے بزرگ
وہ اپنی آنکھوں میں
خوابوں کا اک جہان لیے
تمام عمر کی قربانیاں محبت سے
جو اپنے چاہنے والوں میں
بانٹ دیتا ہے
بزرگ باپ کے بہتر علاج
کی خاطر
ضعیف ماں کی نگاہوں کی
روشنی کے لئے
جوان بیوی کے ہاتھوں کی
چوڑیوں کے لئے
شگفتہ پھول سے بچوں کی
ہر خوشی کے لئے
بھری جوانی کے جذبات
مار دیتا ہے
وہ زندگی کے حسیں دن
گزار دیتا ہے
وطن سے دور یہاں کون
پوچھتا ہے اسے
وہ ٹیس کیا ہے جو ناگن کی طرح
ڈستی ہے
وہ درد کیا ہے
جو آنکھوں سے خوں رلاتا ہے
وہ کیسا غم ہے
جو کھاتا ہے روز و شب اس کو
وطن سے دور بہت دور
اس بیاباں میں
کبھی کبھی تو یقیناً وہ سوچتا ہوگا
یہاں نہ میری کوئی شخصیت
نہ کوئی شناخت
پڑوں اگر کبھی بیمار
کوئی پاس نہ ہو
لگے جو چوٹ تو مرہم کی
کوئی آس نہ ہو
یہاں تو عید بھی تنہا منانی ہے مجھ کو
یہاں خود اپنی ہی میت اٹھانی ہے مجھ کو

☆☆☆

تبصرہ

نام کتاب: کلیاتِ آرزو لکھنوی
مرتب: ڈاکٹر اسرار الحق قریشی
سن اشاعت: 2019
صفحات: 384
قیمت: 299
ناشر اور ملنے کا پتہ: ڈکٹر اسرار الحق قریشی ، کھدرا لکھنؤ
(موبائل: 7081927863)
مبصر: محسن عظیم انصاری
(9455880937)

ڈاکٹر اسرار الحق دنیائے اردو کا ایک منفرد، بے مثل و یگانہ نام ہے۔ممتاز و ممتثل و مُنخرط طبیعت وخو کے مالک ہونے کے ناطے وہ اپنی حُسامِ قلم کو کم رفتاری سے چرکا لگانے میں استعمال کرتے ہیں۔ نیز نشتر زنی کرنا انہیں خوب معلوم ہے، مگر وہ اپنے نشتر خانے کے تیغِ قلم سے ان دنوں زیادہ کام لے رہے ہیں۔ پون درجن کتب پر خامہ فرسائی ہو چکی۔ مشہور کتب جن پر انہوں نے کام کیا وہ درج ذیل ہیں:

(۱) ضیاءِ شمسؔ (۲) عرفان عباسی کے چند خاکے (۳) اردو شعر و ادب کے ارتقا میں لکھنؤ کے ہندو شعرا کا حصہ (۴) لکھنؤ کی ظریفانہ شاعری (۵) طلسم اردو (۶) افکار ساحلؔ (۷) شمع رسالت (۸) کلیاتِ آرزو۔

اردو نظم سے انہیں بڑا اُنس ہے۔ مجھے قلق ہے کہ بیچاری نثر جس کے سہارے ان کا اسپِ قلم گردش میں ہے، ان سے بہت کچھ کی متقاضی ہے۔ڈاکٹر اسرار الحق کے ذریعے نثر کی خدمت عالیہ کی جارہی ہے۔ ان کے کرتب اردو کے اکھاڑے پر دیکھے جارہے ہیں اور دیکھے جائیں گے۔ جناب کشتی کا بڑا داؤں یعنی گازردار (دھوبی پاٹ) خوب جانتے ہیں۔اسرار کی ترتیب کردہ کتاب 'کلیات آرزو' پر خامہ فرسائی کرنی ہے۔

کتاب کا انتساب ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی کے نام معنون ہے۔ اردو حلقے کا جانا پہچانا مہتاب ہیں ڈاکٹر عصمت۔ وہ اردو کے ماہِ نخشب نہ ہو کر ماہِ کنعان سے ہیں۔ان کی جانب سے دو لفظ کلیات آرزو میں ہوتے، تو اردو کو تازہ خون مل جاتا اور اس کے حسن میں اضافہ ہوتا۔

اردو کے مایۂ ناز شاعر و نثر نگار، مضمون دگر جیسے افسانہ نگاری کے ماہر فن سید انور حسین آرزوؔ لکھنوی کی محنت کا فہ کو ڈاکٹر عزیزی اسرار الحق قریشی نے کلیات کی شکل دے کر اردو چمنستان میں منصۂ شہود پر رکھا ہے۔ صفحات 384 ہیں، درون کے ٹائٹل پیج کو ملاحظہ کر۔

محترم و مکرم جناب سر محمد اقبال کو علامہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سر اقبال اگر جہانِ اردو میں فضا کی طرح ہیں، تو آرزو لکھنوی بھی اودھ کی فضائے بسیط کی طرح ہیں۔ وہ یوں تو سہلِ ممتنع کے ماہر تھے، لیکن ہندی الفاظ کی گرفت میں وہ یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔اس کی خاص وجہ ہے۔انہیں استاذ الاساتذہ میر ضامن علی جلالؔ لکھنوی کا ورثہ ملا تھا۔ پروفیسر محمد حسن نے لکھا ہے:

''آرزوؔ لکھنوی کی نظر زبان و بیان، قواعد و عروض پر بہت گہری تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میر ضامن علی جلال لکھنوی کا انہیں ورثہ ملا تھا اور جلالؔ 'سرمایۂ اردو زبان' جیسی لغت کے مصنّف تھے۔ آرزوؔ لکھنوی نے زبان کے اصول و قواعد مُدوّن کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ 'نظام اردو' اس کی شاندار مثال ہے۔''

کہتے ہیں کہ دہلی کی شاعری میں 'آہ، حزن و ملال' ہے، لکھنؤ کی شاعری میں 'واہ، اہاہا اور اماں کیا کہنے' کی صدا پائی جاتی ہے۔ان باتوں کو ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے مثالیں پیش کر کے صفحات کو روشنائی پلائی ہے۔مجاہد حسین نے بھی 'آرزوؔ لکھنوی حیات و خدمات' عنوان سے ۱۹۶۲ء میں ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا اور دلنواز پبلی کیشن، ممبئی سے شائع کرایا تھا۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ اس کتاب اور یوپی اردو اکادمی کی سعی سے آرزوؔ پر کتاب دینا اس بات کا عکاس ہے کہ آرزوؔ لکھنوی کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ آن لائن ریختہ ڈاٹ کام سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

سہلِ ممتنع کے تکلف سے استاد شعراء میں اقبالؔ، مومنؔ، آتشؔ اور داغؔ و غالبؔ، نیز حالیؔ اور اکبرؔ الہ آبادی کو یاد کیا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے شعراء میں ناسخؔ، امیرؔ مینائی، میر انیسؔ، ناطقؔ، آتشؔ، سراجؔ، ولی الحق، فیروز نظامی وغیرہ مشہور ہیں۔آرزوؔ بھی اس صف کے شاعرِ کبیر ہیں ؎

نہ کیوں ہوں آرزوؔ قائل تیری رنگین خیالی کے
قلم رنگیں، زباں رنگیں، سخن رنگیں، بیان رنگیں

آرزوؔ لکھنوی پر گہری نظر رکھنے والے مرتب اکرم عزیزی اسرار الحق نے دل کے سارے دریچے ہی وا نہیں کئے، بلکہ سارے روزن بھی وا کئے اور 'پوروا بیار' کو لکھنؤ سے دہلی، بکنگھم، واشنگٹن اور پھر پلٹا کر دوبئی ہوتے ہوئے پورے ہندو پاک میں لانے کی حقیقی کوشش کی ہے۔وہ اس میں کلی طور پر کامیاب ہیں۔

'کلیات آرزوؔ' میں 'فغانِ آرزوؔ'، 'نشانِ آرزوؔ'، 'سُریلی بانسری'، 'مقدمہ'، دو افسانے 'ایک کٹھن رات' اور 'سہاگی ستی' شاملات میں ہیں۔'مقدمہ' بڑا جامع ہے۔لکھنؤ اردو دنیا کے علامہ آرزوؔ لکھنوی کے اشعار در شہوار آپ کی نذر ہوں، میں واضح کر دوں کہ ہندی آمیز اشعار بھی گُہر سے کم نہیں ہیں۔

آرزوؔ کھل گئی نفس کی کڑی
ختم ہے دور اس تسلسل کا

☆ ☆ ☆

نام کتاب: رشید حسن خاں کی ادبی جہات
مصنف: ڈاکٹر ابراہیم افسر
سن اشاعت: 2021
صفحات: 718
قیمت: 400روپئے
مطبع وملنے کا پتہ: اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: محمد سعید اختر (ریسرچ اسکالر مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی لکھنؤ کیمپس)

رشید حسن خاں کے مضامین کو مختلف عناوین کے تحت ڈاکٹر ابراہیم افسر نے متعدد کتابوں کی صورت میں جمع کر کے شائع کیا ہے۔ رشید حسن خاں کی شخصیت اور فن پر انھوں نے ''رشید حسن خاں اپنی تحریروں کے آئینے میں'' کے عنوان سے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جو رشید حسن خاں کے پرستاروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ اس کے علاوہ بھی ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ''رشید حسن خاں کی ادبی جہات'' ڈاکٹر ابراہیم افسر کی تصنیف کردہ وہ کتاب ہے جس پر میرٹھ یونی ورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی ہے۔ کتاب کے مشتملات اس کی پختگی لیے ہوئے ہیں کہ اسے رشید شناسی میں غیر معمولی اہمیت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔

ابراہیم افسر کی یہ کتاب ''رشید حسن خاں کی ادبی جہات'' کل نو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب احوال وکوائف سے متعلق ہے جس میں رشید حسن خاں کی شخصیت، حالاتِ زندگی، گھریلو حالات، معاشی مشکلات وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ کتاب کا دوسرا باب ''رشید حسن خاں کی ادبی زندگی کا آغاز (تحقیقی و تنقیدی جائزہ) کے نام سے ہے جس میں مصنف نے رشید حسن خاں کی تحقیق کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ کتاب کا تیسرا باب ''رشید حسن خاں کی تحقیقی خدمات'' سے متعلق ہے اس باب میں ڈاکٹر ابراہیم افسر نے خاں صاحب کی دو مشہور اور مستند کتاب ''ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ'' اور تدوین تحقیق اور روایت'' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ رشید حسن خاں کی تحقیقی خدمات کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ'' خاں صاحب کا اصل میدان تحقیق تھا اور انھیں اس سے بے پناہ انس تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف تحقیق کے میدان میں روایت سے انحراف کیا بلکہ نئے اصول وضوابط بھی پیش کیے جو ان کے سنجیدہ غور وفکر کے غماز ہیں'' (ص 116)۔ ڈاکٹر ابراہیم افسر کے اس خیال کی تائید کی جانی چاہئے کہ ابتدا میں خاں صاحب کو بہت پسند کیا گیا ان کی تحریروں کا استقبال کیا گیا مگر بعد میں ان پر ایک طرح کے منفی نقاد کا لیبل لگا دیا گیا۔ اس سے خاں صاحب کا کچھ نقصال تو ہوا نہیں البتہ اپنے موقف میں مزید سختی کا ایک جواز انھیں ضرور مل گیا۔

کتاب کے چوتھے باب کا عنوان ہے'' رشید حسن خاں کی تنقیدی خدمات'' اس باب میں رشید حسن خاں کی تنقیدی خدمات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے اس باب میں ان کی کتاب ''تفہیم اور تلاش وتعبیر'' کو ان کی تنقیدی بصیرت کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا پانچواں باب'' رشید حسن خاں کی تدوینی خدمات'' کئی معنوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ کتاب کا یہی سب سے طویل باب بھی ہے۔ اس باب میں رشید حسن خاں صاحب کی ان تمام کتابوں کا مطالعہ کیا گیا ہے جس کی انھوں نے تدوین کی ہے۔ جن میں ''فسانۂ عجائب، باغ وبہار، گلزار نسیم، مثنویات شوق، مثنوی سحر البیان، مصطلحات ٹھگی، زٹل نامہ [کلیات جعفر زٹلی]، مقدمہ شعرو شاعری، موازنۂ انیس و دبیر، انتخاب نظیر اکبر آبادی، انتخاب ناسخ وغیرہ کا مختصر اجائزہ پیش کیا ہے۔ رشید حسن خاں صاحب نے جن کتابوں کی تدوین کی ہے دراصل اس باب میں انھیں ثباتی اور معیاری کہا جاتا ہے۔ اس توجہ اور محنت سے تدوینی کام بالعموم انجام نہیں دیے گئے۔ ڈاکٹر ابرہیم افسر نے رشید حسن خاں کو بلند پایہ مدون قرار دیا ہے۔ ان کے بقول رشید حسن خاں نے جو تدوینی اصول وضع کیے تھے ان پر تمام عمر کاربند رہے اور اس کے اعلیٰ نمونے کتاب کی صورت میں قبول کرتے رہے۔

ڈاکٹر ابراہیم افسر نے لکھا کہ'' کلاسیکی متون جس محنت اور لگن سے رشید حسن خاں نے مرتب کیا ہے اس کی دوسری مثالیں کم یاب ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تدوینی کوششیں ایک مثال کے طور پر نئی نسل کے سامنے پیش کی جاسکتی ہیں۔'' (ص 247)

چھٹے باب کا عنوان ''املا زبان وقواعد اور فرہنگ سازی کے باب میں رشید حسن خاں کی خدمات'' ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے رشید حسن خاں کی کتاب ''اردو املا، اردو کیسے لکھیں، زبان اور قواعد، عبارت کیسے لکھیں انشا اور تلفظ، کلاسکی ادب کی فرہنگ [جلد اول] پر گفتگو کی ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے اہم ہے کہ زبان وبیان کے مسائل اور انشا سے متعلق بعض مباحث کا تعارف اور جائزہ ہمارے سامنے آگیا ہے۔ اس کے علاوہ ''رشید حسن خاں کے خطوط کا تنقیدی جائزہ، بیاضِ رشید حسن خاں اور منظوم خراجِ عقیدت بھی شامل کتاب ہیں۔

رشید حسن خاں کی حیات وخدمات پر اس قدر مفصل انداز میں یہ پہلی باضابطہ کوشش کہی جائے گی۔ فاضل مصنف نے رشید حسن خاں سے متعلق تمام مباحث کا نہ صرف احاطہ کیا ہے بلکہ مصادر و منابع سے خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ کتاب کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں سے متعلق تمام تحریریں ابراہیم افسر کے سامنے ہیں۔ اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کی تحریروں سے بھی ابراہیم افسر نے استفادہ کیا ہے۔ کتاب پڑھنے والا اس تحقیق کی داد ضرور دے گا۔ سر ورق دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب کی طباعت بھی بہت عمدہ ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ اور قارئین کو آسانی سے دستیاب بھی ہے۔ ☆☆☆

مراسلات

محترم ڈاکٹر سلیم احمد السلام علیکم

آج سہ ماہی ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ (مارچ تا مئی) موصول ہوا۔ ماشاءاللہ بہت خوب۔ ٹائٹل کور اور مضامین کا اچھا انتخاب کیا ہے خاص طور سے شمس الرحمن فاروقی کی رباعی گوئی اور عبدالرشید ظہیری پر مضمون بہت عمدہ ہے۔ اس کے علاوہ اصغر عباس کے خطوط کا مطالعہ ڈاکٹر شکیل احمد کا پسند آیا۔ ساتھ ہی افسانہ اور غزلیات و نعت بھی اچھی لگی۔ مراسلات اور تبصرے بھی خوب ہیں۔ ایک بار پھر مبارک باد قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر عبدالحق امام (گورکھپور)
موبائل:9450878330

محترمی ومکرمی! السلام علیکم

ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ (ستمبر تا نومبر ۲۰۲۲ء) موصول ہوا۔ حسب معمول اس شمارے میں شامل تمام نثری وشعری نگارشات بھی معیاری اور قابل مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا مضمون ''شبلی شناسی کے گلِ سر سبز: مولانا سلیمان ندوی'' نہایت شاندار و جاندار ہے۔ ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری کا مضمون بھی اچھا ہے۔ موصوف نے حسرت موہانی کی نثری کاوشوں کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر معراج الدین خاں نے فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' پر بھرپور مضمون تحریر کیا ہے۔ ایسے مضامین فن پارے کی تفہیم اور اس کی قدر و قیمت کے تعین میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ دیگر مضامین اور افسانے اور شعری تخلیقات بھی عمدہ ہیں۔ نگارشات کا انتخاب، ترتیب اور رسالے کی طباعت قابل تحسین ہے۔

پچھلے پانچ برسوں کے تقریباً تمام شمارے میری نظروں سے گزرے ہیں۔ آپ نے ابتدا ہی سے ''ادبی نشیمن'' کو ایک معیار عطا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں آپ کو خاصی کامیابی بھی ملی ہے۔ اس سے آپ کی ادارتی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آپ کا یہ رسالہ اور بھی مقبولیت حاصل کرے گا۔ آپ نے اپنے اس رسالے کو تخلیق، تنقید اور تحقیق کا حسین مثلث بنا دیا ہے۔ ان تینوں چیزوں کو آپ جس سلیقے سے پیش کرتے ہیں اس سے رسالے کے مشمولات میں توازن برقرار رہتا ہے اور ہر عام وخاص قاری وقلم کار کو اپنی پسند کی چیز اس میں مل جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ بھارت سے شائع ہونے والے ادبی رسائل میں ایک اور معیاری ومعتبر رسالے کا اضافہ ہوا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اسے مزید عروج عطا کرے۔

معاون مدیر کی حیثیت سے شاہد حبیب صاحب کا انتخاب بھی قابل قدر ہے۔ موصوف بڑی اچھی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور زبان وادب کے تعلق سے بڑے مخلص بھی ہیں۔

پروفیسر مقبول احمد مقبول (اُدگیر، مہاراشٹر)
موبائل:9028598414

محترمی ومکرمی! سلام مسنون

ابھی چند روز قبل ادبی نشیمن (جون تا اگست) موصول ہوا، مطالعہ جاری ہے، ابھی سرسری طور پر ہی دیکھا ہے، لہذا صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ رسالہ معیاری معلوم ہوا۔ اداریہ اور ڈاکٹر محمد کلیم ضیا صاحب کی حمد باری تعالیٰ و ڈاکٹر ریشما قمر کی نعت پاک پڑھ کر ایڈیٹر جناب ڈاکٹر سلیم احمد صاحب کے اعلیٰ ذوق کا اندازہ ہوا، جس میں دینی مزاج کی آمیزش ہے۔ اس کے لئے انہیں بہت بہت مبارکباد۔ ڈاکٹر حبیب راحت حباب کے ''دوہوں'' نے اچھا تاثر قائم کیا۔ ادبی نشیمن کے سبھی قارئین کی خدمت میں آداب پیش کرتا ہوں۔ شکریہ

جمال اظہر صدیقی (بہرائچ)
موبائل:805296445

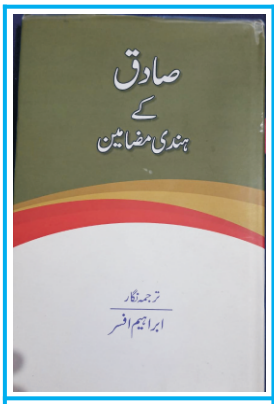
بخدمت ایڈیٹر صاحب سلام مسنون

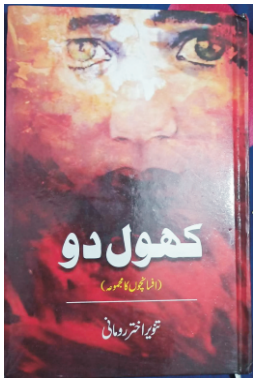
سہ ماہی ادبی نشیمن کا تازہ شمارہ (مارچ، اپریل، مئی 2022) حاصل ہوا۔ فرنٹ پیج پر انتظار نعیم کی دل موہ لینے والی نظم ''پھر جنگ ہوئی'' پڑھتے ہی یوکرین کا دردناک منظر میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ اداریہ پڑھ کر احساس ہوا کہ واقعی اردو زبان کے فروغ میں نشستوں کا اہم کردار ہے، اس کی اہمیت کو سمجھا جانا چاہئے۔ جیسا کہ ایڈیٹر صاحب نے کہا کہ اردو کی زبوں حالی کے لئے محض سرکار کو ذمہ دار ٹھہرانا غلط ہوگا، اس کے فروغ کے لیے اردو زبان سے منسلک سبھی لوگوں کا تعاون اشد ضروری ہے، یہ برحق ہے۔ مضامین کی فہرست میں شامل ایک سے ایک بہترین تحریر ادبی نشیمن کے اس شمارے میں مجھے پڑھنے کو ملی جو کہ میرے علم میں اضافے کا باعث بنی۔ مضامین سے نظر ہٹی تو ڈاکٹر قدسیہ بانو کے افسانہ (رپوٹیشن) پر جا ٹھہری جو کہ زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ واقعی رپوٹیشن کی خاطر انسان اپنی انسانیت کو کھو بیٹھا ہے۔ غزلیات میں (رفعت عزمی، ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، ڈاکٹر فریاد آزر، موج لکھنوی اور ڈاکٹر کہکشاں خاں جلال پوری) جیسے بہترین و دلچسپ غزل گو شعرا کو پڑھنے کا موقع ملا بالخصوص کہکشاں خاں کا یہ شعر حالات پر صادق آرہا ہے:

کہیں نفرتوں کے شعلے تجھے بھی نہ زد میں لے لیں
میرے گھر کے ہی برابر ترا بھی ہے آشیانہ

آخر میں معاون ایڈیٹر شاہد حبیب صاحب کے لکھے دو کتابوں پر تبصرے نے مجھ پر ان کے وسیع علم کا گہرا اثر ڈالنے کے ساتھ ہی بے حد متاثر بھی کیا۔ مختصراً یہ کہ ادبی نشیمن کے سبھی مشمولات علم وادب کی خوشبو سے پُر ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ یہی خصوصیت ادبی نشیمن کو انفرادیت عطا کرتی ہے۔

اقراء قاضی (مانو لکھنؤ کیمپس)

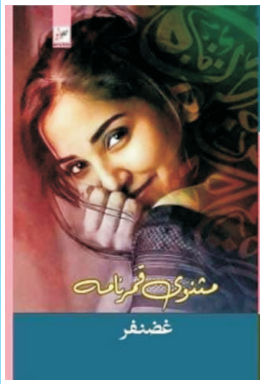


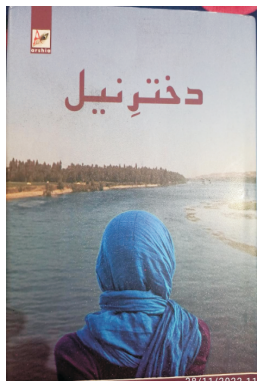


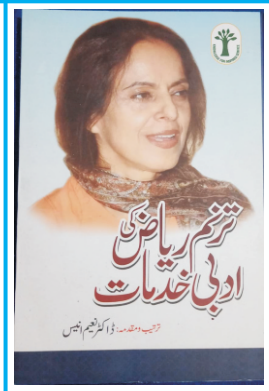




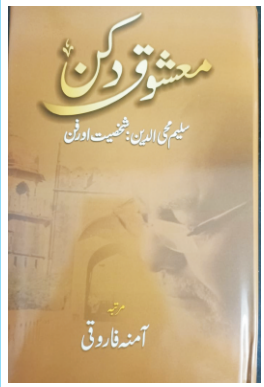


















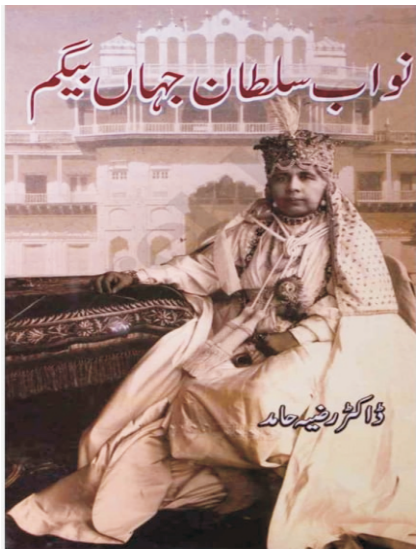
شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں "اردو کی ادبی صحافت" کے موضوع پر منعقدہ عالمی سیمینار میں "سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ: ایک جائزہ" کے عنوان سے اپنا تنقیدی مقالہ پڑھتے خواجہ معین الدین چشتی لسان یونیورسٹی، لکھنؤ کے اسسٹنٹ پروفیسر جناب ڈاکٹر اعظم انصاری۔

Vol: 6, Issue: 01
Dec. to Feb.2023

Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy : 25/-
Biannaul Subscription :300/-

دستاویز



نواب سلطان جہاں بیگم

(۱۸۵۸-۱۹۳۰)

انقلاب ۱۸۵۷ کی ناکامی کے بعد سرسید کی شخصیت پر مرتب ہونے والے اثرات نے علی گڑھ تحریک کو جنم دیا تھا۔ سرسید کو جہاں اپنے مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹوں کا سامنا کرنا اور ناروا تنقیدیں برداشت کرنی پڑی، وہیں ان کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ انھیں میں روشن خیال خاتون اور بھوپال کی حکمراں نواب شاہجہاں بیگم کا نام سرفہرست ہے۔ جنھوں نے سرسید کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی اور ساتھ دیا بلکہ دل کھول کر تعاون بھی کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی نواب سلطان جہاں بیگم نے سرسید کے مشن میں تعاون دیا اور اپنی ماں کی روایت کو آگے بڑھایا۔ نواب سلطاں جہاں بیگم ایک باذوق اور علم پرور حکمراں تھیں۔ ان کی پیدائش بھوپال میں ۹ / جولائی ۱۸۵۸ کو ہوئی۔ انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ادب، تاریخ اور معاشیات سے ان کو خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کا شمار صرف ریاست بھوپال کی حکمراں کے طور پر ہی نہیں ہوتا بلکہ انھیں معمار قوم کے طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے اس وقت جب کہ لڑکیوں کے لیے عصری تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا، انھوں نے تعلیم نسواں کو فروغ دینے پر زور دیا۔ انھوں نے خواتین کے لیے "لیڈیز کلب" قائم کیا اور ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انھیں خودمختار بنانے کی غرض سے دستکاری اور ہنر سے جوڑنے کا بھی انتظام کیا۔ سلطان جہاں بیگم نے امورِ حکومت کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ تعلیم اور ادب پر بھی خصوصی توجہ دی۔ تعلیم پر زور دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ "تعلیم اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ ہوا اور پانی جینے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔" وہ پہلی خاتون تھیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی چانسلر بنیں اور اس ذمے داری پر وہ تاحیات بنی رہیں۔ ان کے بعد ان کے لڑکے نواب حمیداللہ خاں چانسلر بنے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے یونیورسٹی کی ترقی کے لیے سلطان جہاں منزل، سلطانیہ ہاسٹل، عبیداللہ خاں اور نصراللہ خاں کے نام سے ہاسٹلز کی تعمیر کرائی۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے مختلف تعلیمی ادارے قائم کئے، کتابیں لکھوائیں اور خود بھی تقریباً تینتالیس کتابیں تصنیف کیں۔ جس میں "تاریخ بھوپال، روضۃ الریاحین (سفرنامۂ حجاز)، بچوں کی پرورش، فرائض النساء، تربیت اطفال، تزک سلطانی، حیات شاہجہانی، سیرت مصطفیٰ، ڈومیسٹک اکانومی" ان کی کچھ اہم کتابیں ہیں۔ گوہر اقبال اور اخترِ اقبال کے نام سے انھوں میں اپنی خودنوشت بھی لکھی۔ انھوں نے علی گڑھ کالج میں نسواں اسکول کا افتتاح بھی کیا اور بورڈنگ ہاؤس کی بنیاد رکھی جو سلطان جہاں منزل میں قائم ہے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کا انتقال ۱۲ /مئی ۱۹۳۰ کو ہوا اور کوہِ فضا صوفیا مسجد کے احاطے میں سپردِ خاک ہوئیں۔ بھوپال سے تعلق رکھنے والی معروف مصنفہ محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ نے "نواب سلطاں جہاں بیگم" کے عنوان سے ایک علمی کتاب لکھ کر نواب صاحبہ کی حیات وخدمات کا عمدہ تعارف کرایا ہے۔ کتاب ۲۰۱۰ میں شائع ہوئی اور بے پناہ مقبولیت کے سبب ۲۰۱۱ میں ہی اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آگئی۔ نواب سلطان جہاں نے ملک وملت اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعمیر وترقی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، اسے اتنی جلدی بھولنے کے بجائے ان کی کارکردگی سے نئی نسل کو روشناس کرانا وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

Printed,Published & Prop. By **Ahmad Rashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow
Editor: Dr. Saleem Ahmad